ذکرِ غالب



مکتبہ جامعہ
دہلی

ذکرِ غالبؔ

ذکرِ غالب

از

مالک رام

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی

قیمت ۳ سے

بار سوم

صدر دفتر
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
جامعہ نگر۔ دہلی

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
اردو بازار
دہلی ۶

شاخ
مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ
بمبئی ۳

پہلا ایڈیشن اپریل ۱۹۳۶ء
دوسرا ایڈیشن اکتوبر ۱۹۵۰ء
تیسرا ایڈیشن جنوری ۱۹۵۵ء

یونین پرنٹنگ پریس، دہلی

غالب نامِ آورم نام و نشانم مپرس   ھم اسداللّھم و ھم اسد اللّھیم



ہوگا کوئی ایسا بھی جو غالب کو نہ جانے

شاعر تو وہ اچھّا ہے پہ بدنام بہت ہے

دیباچہ

اربابِ نظر کے ایک چھوٹے سے حلقے میں تو غالبؔ اپنی زندگی ہی میں مقبول ہو چکے تھے لیکن جسے قبولِ عام کہتے ہیں وہ ان کو ایک مدت تک حاصل نہیں ہوا۔ ان کے کلام کی صحیح قدر لوگوں کو اُس وقت معلوم ہوئی جب مولانا حالیؔ نے مقدمہ شعر و شاعری لکھ کر اپنے ہم عصروں کے مذاقِ شعر کو نکھارا اور "یادگارِ غالبؔ" لکھ کر یہ ثابت کیا کہ اس نکھرے ہوئے مذاق کی تسکین غالبؔ کے کلام سے بخوبی ہو سکتی ہے۔ انگریزی دانوں میں غالبؔ کا چرچا زیادہ تر عبدالرحمٰن بجنوری کے مقدمے اور دیوانِ غالبؔ کے برلن ایڈیشن اور چغتائی ایڈیشن کی بدولت ہوا۔ پچھلی چوتھائی صدی میں اقبالؔ کی شہرت اور مقبولیت نے پچھلے شاعروں کے نقش کو اگر مٹایا نہیں، تو مدھم ضرور کر دیا، لیکن غالبؔ کا نقش اتنا گہرا اور روشن تھا کہ اس کی

آب و تاب میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔

غالبؔ کی عظمت کی ایک بڑی نشانی یہ بھی ہے، کہ جتنی اچھی اور اونچے درجے کی کتابیں ان کی زندگی اور شاعری پر لکھی گئیں، اتنی کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئیں۔ حالیؔ کی "یادگارِ غالبؔ" سے جو سلسلہ شروع ہوا تھا وہ برابر جاری رہا۔ اس کی وہ کڑیاں جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ غلام رسول مہرؔ صاحب کی "غالبؔ"، محمد اکرام صاحب کی معرکے کی تصنیف "غالبؔ نامہ" اور مالک رام کی "ذکرِ غالبؔ" ہے جس کا نیا ایڈیشن مکتبہ جامعہ لمیٹڈ آپ کے سامنے پیش کر رہا ہے۔ یہ اس تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک غالبؔ کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہے۔ اس کے علاوہ اس میں مالک رام صاحب نے نئے ماخذوں کو کھنگال کر نئی معلومات فراہم کی ہے جو کہیں اور نہیں ملتی۔ پہلا ایڈیشن بھی اس لحاظ سے کچھ کم امتیاز نہیں رکھتا تھا اور موجودہ ایڈیشن میں تو ایسے مفید اضافے ہوئے ہیں کہ اہلِ ذوق کی نظر میں کتاب کی قدر و قیمت اور بڑھ گئی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس پُر آشوب زمانے میں بھی جو علم و ادب کی کساد بازاری کا دَور ہے ذکرِ غالبؔ ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

سیّد عابد حسین

فہرست مضامین

دوسرا باب — تصنیفات

ا- فارسی

ب- اردو

ج- قاطع برہان کا مباحثہ

قطعه

غالب از خاکِ پاکِ تورانیم — لاجرم در نسب فره مندیم
ترک زادیم و در نژاد همے — به سترگانِ قوم پیوندیم
ایبکیم از جماعهٔ اتراک — در تمامی ز ماه ده چندیم
فنِ آبائے ما کشاورزیست — مرزبان زادهٔ سمرقندیم
ور ز معنی سخن گزاردهٔ — خود چه گوئیم تا چه و چندیم
فیضِ حق را کمینه شاگردیم — عقلِ کل را بهینه فرزندیم
هم بتابش ببرق همنفسیم — هم به بخشش به ابر مانندیم
به تلاشیکه هست فیروزیم — به معاشیکه نیست خرسندیم

همه بر خویشتن همی گرییم
همه بر روزگار می خندیم

پہلا باب

سوانح حیات

آباواجداد میرزا غالب نے کتنی جگہ لکھا ہے کہ میرا سلسلۂ نسب تور ابنِ فریدوں سے ملتا ہے۔ اس لیے سب سے پہلے یہاں ان کے خاندان کا مختصر تذکرہ بے محل نہیں ہوگا۔

دنیا کے تمام ملکوں کی ابتدائی تاریخ پر دیومالا کے ایسے گہرے پردے پڑے ہیں کہ اس میں سے افسانہ اور حقیقت کو الگ الگ کرنا ناممکن ہے۔ ایران بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ مورخوں نے یہاں کے شاہی خاندانوں کو ابتدائے عالم سے یزدگرد ساسانی تک پانچ سلسلوں میں تقسیم کیا ہے۔ آبادی۔ جیئی۔ شائی۔ یاسائی اور گلشائی۔ ان میں سے پہلے چار سے متعلق ہمارا علم بہت محدود ہے اور جو کچھ ہے وہ بھی تاریخی اعتبار سے کچھ ایسا قابلِ اعتماد نہیں۔ البتہ جب ہم پانچویں سلسلے یعنی گلشائیوں تک پہنچتے ہیں، تو اس اندھیرے میں کچھ کچھ اُجالا نظر آنے لگتا ہے، اگرچہ اس کی ابتدا بھی اُجالے سے زیادہ اندھیرے ہی میں ہے۔

گلشائی سلسلہ چار گروہوں پر مشتمل ہے۔ اول[1] پیشدادی۔ دوم[2] کیانی۔

سوم اشکانی اور چہارم ساسانی۔ ساسانی گروہ کا آخری بادشاہ یزدگرد ثالث تھا، جسے حضرت سعد بن ابی وقاص نے خلیفہ ثانی حضرت عمرؓ کے عہد میں قادسیہ کے مقام پر شکست فاش دی۔ (یکم جون ۶۳۷ء) اور دار الخلافہ المدائن مسلمانوں کے قبضے میں آگیا۔ اس کے بعد اگرچہ یزدگرد نے مقابلے کی کوشش کی اور دو تین جھڑپیں بھی ہوئیں، لیکن نہاوند کی لڑائی (۱۴۲ھ) نے عملی طور پر جنگ کا خاتمہ کر دیا۔ یزدگرد اس کے بعد بھی دس گیارہ برس تک ہاتھ پاؤں مارتا رہا لیکن ایران میں درفشِ کاویانی ہمیشہ کے لئے سرنگوں ہو گیا اور یہ "ملک کیان" بھی اسلامی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ یہی گروہِ اوّل یعنی پیشدادی میرزا غالب کے آباواجداد ہیں۔

پیشدادی خاندان کا بانی کیومرس تھا۔ ایرانی اسے "وخشور" یا نبی بھی مانتے ہیں۔ جشنِ سدہ سب سے پہلے اسی نے منایا۔ بعض مورخوں کا دعویٰ ہے کہ دنیا میں آئین جہانبانی کا بانی کیومرس تھا اور شہر بسانے کی رسم بھی اسی نے ڈالی۔ دماوند اور اسطخر اور بلخ تینوں شہر اس کی یادگار ہیں۔ اس کے بعد اس کا پوتا ہوشنگ بن سیامک تخت پر بیٹھا۔ ایرانی اسے بھی وخشورِ عہد کہتے ہیں۔ کتاب "جاوداں خرد" بھی جس کا ترجمہ مامون الرشید عباسی کے عہد میں حسن بن سہل نے عربی میں کیا تھا ہوشنگ ہی سے منسوب ہے۔ یہ بادشاہ اتنا صاحبِ عدل اور رعایا پرور تھا کہ رعایا نے اسے "پیش داد" یعنی عادلِ اوّل کے خطاب سے نامزد کیا۔ اسی سے خاندان کا نام پیشدادی پڑ گیا۔ فردوسی کہتا ہے کہ سب سے

پہلے آگ اسی کے عہد میں دریافت ہوئی جو دو پتھروں کی اچانک رگڑ سے پیدا ہوئی تھی۔ لکھتا ہے سہ

جہاندار پیشِ جہاں آفریں نیایش ہمی کرد و خواند آفریں
کہ اورا فروغِ چنیں ہدیہ داد ہمیں آتش آں گاہ قبلہ نہاد
بگفتا، فروغیست ایں ایزدی پرستیدہ باید، اگر بخردی

گویا اس نے نورِ خداوندی کو ایک نعمت خیال کیا۔ اس پر خدا کا شکر ادا کیا اور اپنی رعایا کو بھی شکر بجالانے کی ہدایت کی۔ ایران میں آتش پرستی یہیں سے شروع ہوئی۔ ایرانیوں کا دعویٰ ہے کہ سوس اور بابل دونوں شہر بھی ہوشنگ نے تعمیر کئے۔ اگرچہ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بابل کی بنیاد ضحاک کے زمانے میں پڑی۔

ہوشنگ کا جانشین تہورس تھا اور اس کے بعد جمشید تخت نشین ہوا۔ جشنِ نوروز کی ابتدا اسی کے زمانے میں ہوئی۔ اور ایک روایت کے مطابق شرابِ انگور بھی اسی کی ایجاد ہے۔ جامِ جم کو تو ہمارے شاعروں نے حیاتِ جاودانی بخش دی ہے۔ جمشید کے آخری ایام میں ایک شخص ضحاک نے بغاوت کی اور جمشید کو آرے سے چیر کر ہلاک کر دیا۔ مگر خود اتنا ظالم اور شقی تھا کہ جلد ہی خلقِ خدا اس سے تنگ آگئی۔ آخر کار لوگوں نے اُسے تخت سے اُتار دیا اور اس کی جگہ جمشید کے پوتے فریدوں بن آبتین کو اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ ممکن نہیں کہ فریدوں کا نام آئے اور اس کے ساتھ کاوہ آہنگر اور اس کا

درفشِ کاویانی ذہن میں نہ آئیں۔ اگرچہ ایران میں آتش پرستی ہوشنگ کے زمانے سے ہورہی تھی مگر سب سے پہلا آتش کدہ فریدوں ہی کے عہد میں تعمیر ہوا۔ یہی فریدوں میرزا غالبؔ کا جدِ اعلیٰ ہے۔

فریدوں کے تین بیٹے تھے۔ ایرج، تہمورس کی نواسی ارنواز یا ایران دخت کے بطن سے اور تور اور سلم دو بھائی ضحاک کی بیٹی سے۔ اس نے سلطنت تینوں بھائیوں میں تقسیم کردی۔ پایۂ تخت کا مرکزی علاقہ سب سے بڑے بیٹے ایرج کے حصے میں آیا۔ مشرقی اضلاع تور کو ملے اور مغربی سلم کو۔ تور اور سلم اس تقسیم سے ناخوش تھے۔ رشک و حسد نے اپنا کام کیا اور دونوں بھائیوں نے سازش کرکے ایرج کو قتل کردیا۔ مگر دل کی مراد پھر بھی بر نہ آئی۔ فریدوں نے اپنے بعد تخت نشینی کے لئے ایرج کے بیٹے منوچہر کو نامزد کیا۔ جو اپنے والد کی وفات سے چھ ماہ بعد پیدا ہوا تھا۔ منوچہر نے حکومت کی باگ ڈور ہاتھ میں لیتے ہی اپنے باپ کے قاتلوں سے انتقام لینے کی ٹھانی۔ تور اور سلم کے لئے سرزمینِ ایران اپنی تمام وسعت اور فراخی کے باوجود تنگ ہوگئی۔ اب یہاں رہنا گویا جان سے ہاتھ دھونا تھا اس لئے ان لوگوں نے کہیں اور چل کر قسمت آزمائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تلوار ہاتھ میں تھی اور اضیبا یاور۔ لڑتے بھڑتے یہ جماعت ترکستان پہنچی اور یہاں ایک نئی سلطنت توران کی داغ بیل ڈالنے میں کامیاب

ہوگئی۔ تور کی نسل سے ایک نوجوان افراسیاب[1] نے منوچہر کو شکست دی۔ مگر پھر صلح صفائی ہوگئی اور یہ طے پایا کہ دریائے آمو یہ دونوں حکومتوں میں سرحد رہے۔ منوچہر کی زندگی تک تو فریقین نے اس عہد نامے کی پابندی کی، مگر جب اس کی موت کے بعد اس کا بیٹا نوذر تخت نشین ہوا۔ تو افراسیاب نے پھر ایران پر حملہ کردیا اور اب کی تخت پر بھی قابض ہوگیا۔ دس بارہ برس بعد ایرانیوں نے دوبارہ بغاوت کی اور ہمیشہ کے لئے تورانیوں کو ایران سے نکال دیا۔ لیکن دونوں خاندانوں میں جنگ کا سلسلہ اس کے بعد بھی مدت تک جاری رہا۔[2]

تورانیوں پر بھی کئی انقلاب آئے۔ زمانے نے کتنی بار ان کی بساط الٹی اور کتنی بار انھوں نے اپنی ہمت اور استقلال سے اسے از سرِ نو بچھایا۔ آخری بار افراسیاب کی نسل سے ترکانِ ایبک نے خراسان، عراق، پارس، آذربایگان میں بویہ اور غزنویہ کے کھنڈروں پر ایک نئی سلطنت کی بنیاد رکھی اور سلاجقہ کے نام سے مشہور ہوئے۔[3]

---

[1] افراسیاب ابنِ پشنگ ابن زادشم ابنِ تور ابنِ فریدوں۔

[2] یہ تمام حالات نامۂ خسرواں (مرزا جلال الدین) سے ماخوذ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایرانی روایات پر مبنی ہیں اور ان کی تاریخی صحت سے متعلق وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

[3] بعض مورخوں کو سلجوقیوں کے تورانیوں کی نسل سے ہونے میں کلام ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب طغرل نے عباسی خلیفہ القائم کی صاحبزادی سے نکاح کی درخواست کی تو اپنے آپ کو عباسیوں کا ہم کفو ثابت کرنے کے لئے یہ نسب نامہ گڑھ لیا، ورنہ یوں اس میں کوئی صداقت نہیں۔

خاندانِ سلجوق کا بانی صحیح معنوں میں طغرل بیگ (۱۰۳۷ء—۱۰۶۳ء) تھا۔ یہ سلجوق کا پوتا تھا۔ جس کے نام پر اس خاندان کا نام سلجوقی پڑا۔ طغرل کے بعد الپ ارسلان (۱۰۶۳ء—۱۰۷۲ء) اور ملک شاہ (۱۰۷۲ء—۱۰۹۲ء) حکمران ہوئے۔ جن کا نام تاریخِ ایران میں شہرتِ دوام کا مالک ہے۔ اسی دور میں نظام الملک طوسی اور عمر خیام آسمانِ سیاست و علم و ادب کے وہ درخشندہ ستارے پیدا ہوئے، جن کی ذات پر ایران رہتی دنیا تک ناز کرے گا۔ فرقۂ باطنیہ کا بانی حسن بن صباح بھی ان کا ہم عصر تھا۔ ملک شاہ کی وفات پر پہلے اس کا بڑا بیٹا محمود (۱۰۹۲ء—۱۰۹۴ء) اور پھر دوسرا برکیارق (۱۰۹۴ء—۱۱۰۴ء) تخت پر بیٹھے۔ غالبؔ اسی برکیارق کی نسل سے ہیں۔

آلِ سلجوق نے بھی تقریباً تین صدیوں تک (۱۰۳۷ء—۱۳۰۰ء) داد و دہش سے حکومت کی۔ آخر خوارزمیوں کے ہاتھوں سلجوقیوں کا شیرازہ بھی بکھرا اور اب کے ایسی بُری طرح بکھرا کہ پھر اس جماعت کو اطمینان سے ایک مرکز میں بیٹھنا نصیب نہ ہوا اور یہ لوگ ماوراء النہر میں پراگندہ ہو گئے۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے رہزنی اور غارت گری کا پیشہ اختیار کیا اور کچھ نے سپہ گری کا۔ اس آخری گروہ میں سے خاندانِ شاہی کے ایک نام لیوا ترسم خاں تھے انھوں نے سمرقند میں اقامت اختیار کی۔[۱]

---

[۱] درفش کاویانی صفحہ ۵۴

یہی ترسم خاں میرزا غالب کے پردادا ہیں۔

میرزا غالب کے دادا قوقان بیگ خاں[1] تھے۔ وہ اپنے باپ سے ناراض[2] ہو کر شاہ عالم کے عہد[3] میں سمرقند سے ہندوستان چلے آئے۔[4] وہ صرف ترکی بولتے اور ہندوستانی بالکل برائے نام جانتے تھے۔ وہ پہلے لاہور میں نواب معین الملک (عرف میر منو) کی ملازمت میں داخل ہوئے۔ پھر نواب معین الملک کی وفات پر لاہور سے دہلی پہنچے اور نواب ذوالفقار الدولہ میرزا نجف خاں کی سرکار سے وابستہ ہو گئے۔[5] نواب ذوالفقار الدولہ ہی کے توسل سے وہ شاہ عالم کی سرکار میں پچاس گھوڑے اور نقارہ و نشان سے ملازم ہوئے۔ ایک سیر حاصل پرگنہ پہاسو جاگیر بطور تنخواہ ان کو سمرو بیگم کی سرکار سے

---

[1] احوالِ غالب صفحہ ۲۷

[2] کلیاتِ نثر (غالب) صفحہ ۱۵۴ (خط بنام مولوی سراج الدین احمد)

[3] یہ غالب کا اپنا بیان ہے اور انھوں نے متعدد مقامات پر یہی لکھا ہے۔ اس کے برخلاف مولانا مہر کی تحقیق یہ ہے کہ شاہ عالم کی جگہ محمد شاہ چاہیے۔ (غالب صفحہ ۱۳) میں غالب کے اپنے بیان کو ترجیح دیتا ہوں۔

[4] درفش کاویانی صفحہ ۵۴-۵۵

[5] کلیاتِ نثر صفحہ ۱۵۴ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

حاصل ہوا تھا، ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ کے لئے مقرر ہوا[1]۔ اور یوں ان کی آرام سے بسر ہونے لگی۔

قوقان بیگ خاں کی اولاد میں چار بیٹے[2] اور تین بیٹیاں تھیں۔ میرزا غالب، منشی نبی بخش حقیر کو ایک خط میں لکھتے ہیں[3]:-

"بھائی صاحب! میں بھی تمھارا ہمدرد ہو گیا یعنی منگل کے دن ۱۸ ربیع الاول کو شام کے وقت وہ پھوپھی کہ میں نے بچپن سے آج تک اس کو ماں سمجھا تھا اور وہ بھی مجھ کو بیٹا سمجھتی تھی، مر گئی۔ آپ کو معلوم رہے کہ پرسوں میرے گویا نو آدمی مرے۔ تین پھوپھیاں اور تین چچا۔ اور ایک باپ اور ایک دادی اور ایک دادا یعنی اس مرحومہ کے ہونے سے میں جانتا تھا کہ یہ نو آدمی زندہ ہیں اور اس کے مرنے سے میں نے جانا کہ یہ نو آدمی آج ایک بار مر گئے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ ان کے والد چار بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ تین بہنوں کی تصدیق اس سرکاری شجرہ سے بھی ہوتی ہے۔ جو میرزا کے چچا نصراللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد، ۷ جون ۱۸۰۶ء کو

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۶۱ (بنام منشی محمد حبیب اللہ خاں ذکا)

[2] نادراتِ غالب ص ۲۹-۳۰ (مکتوبات)

[3] دیکھئے آگے صفحہ ۲۹-۳۰

پانچ ہزار روپیہ سالانہ پنشن کی تقسیم کے لئے لکھا گیا تھا۔ اس میں دوسرے حصہ داروں کے ساتھ پندرہ سو روپیہ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنوں کے لئے مقرر ہوئے تھے۔ ہمیں ان میں سے صرف دو صاحبزادوں کے نام معلوم ہیں۔ میرزا عبد اللہ بیگ خاں اور میرزا نصر اللہ بیگ خاں۔ یہی میرزا عبد اللہ بیگ خاں میرزا غالبؔ کے والد بزرگوار ہیں۔

والدین اور ننھیال میرزا عبد اللہ بیگ خاں کی ولادت دہلی میں ہوئی[1] بظاہر جب تک ان کے والد میرزا قوقان بیگ خاں زندہ تھے، انھیں روزگار کی فکر نہیں ہوئی۔ مگر جب ان کا انتقال ہوگیا اور سلطنت مغلیہ میں بھی طوائف الملوکی کا بازار گرم ہوا۔ تو انھیں اپنی معاش کی فکر دامن گیر ہوئی، میرزا غالبؔ لکھتے ہیں[2]

"دادا کے انتقال کے بعد جو طوائف الملوک کا ہنگامہ گرم تھا۔ وہ علاقہ (یعنی جاگیر پرگنہ پہاسو) نہ رہا۔ باپ میرا عبد اللہ بیگ خاں بہادر لکھنؤ جاکر نواب آصف الدولہ کا نوکر رہا۔ بعد چند روز حیدرآباد جاکر نواب نظام علیخاں کا نوکر

---

[1] کلیات نثر صفحہ ۱۵۴ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

[2] اردوئے معلی صفحہ ۳۶ (بنام منشی حبیب اللہ خاں ذکاؔ) نیز دیکھئے "احوال غالب" صفحہ ۲۰

[3] امیر مینائی "انتخاب یادگار" میں لکھتے ہیں کہ وہ اس سے پہلے ریاست جے پور میں ملازم ہوتے اور اسی زمانہ میں انھوں نے آگرے میں بود و باش اختیار کی۔ کسی اور تذکرہ نگار نے اس کا ذکر نہیں کیا۔

ہوا۔ تین سو سوار کی جمعیت سے ملازم رہا۔ کئی برس وہاں رہا۔
وہ نوکری ایک خانہ جنگی کے بکھیڑے میں جاتی رہی۔ والدنے
گھبرا کر آلور کا قصد کیا۔ راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا۔ وہاں
کسی لڑائی میں مارا گیا۔"

میرزا عبد اللہ بیگ خاں کی شادی آگرہ میں خواجہ میرزا غلام حسین خاں کمیدان کی صاحبزادی عزت النسا، بیگم سے ہوئی[1]۔ وہ لکھنا پڑھنا جانتی تھیں اور خانگی معاملات میں بذاتِ خود خاص دلچسپی لیتی تھیں۔ خواجہ غلام حسین خاں کمیدان سرکار میرٹھ کے ایک فوجی افسر اور آگرہ کے عمایدین میں سے تھے۔ آگرہ میں ان کی کافی جائداد تھی۔ جس کا ذکر خود غالبؔ نے بھی ایک خط میں کیا ہے۔ منشی شیونرائن کو لکھتے ہیں[2]

[1] زمانہ (کانپور) جولائی ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۶۔ زمانہ کی اس اشاعت میں ایک مضمون چھپا ہے جس میں غالبؔ کے ایک فارسی خط کی نقل ہے۔ اصل خط نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمٰن خاں شروانی مرحوم کے کتب خانہ (حبیب گنج) میں محفوظ ہے۔ یہ خط غالبؔ نے آگرہ کے دو شخصوں خداداد خاں اور ان کے بیٹے ولی داد خاں کے نام لکھا تھا۔ اس خاندان کے میرزا غالبؔ کی ننھیال کے ساتھ لین دین کے تعلقات تھے۔ میرزا غالبؔ اس خط میں لکھتے ہیں کہ چوں کہ والدہ صاحبہ خود لکھ پڑھ سکتی ہیں۔ اس لئے جب تک کوئی تحریر ان کی دستخطی اور مہری نہ ہوگی " پایۂ اعتبار سے ساقط متصور" ہوگی۔ خط کی تاریخ غلط لکھی گئی ہے۔ میرے خیال میں یہ خط ۱۸۴۰ء کا ہے۔

[2] اردوئے معلی صفحہ ۲۶۴، خطوط غالبؔ (۱: ۳۸۰ — ۳۸۱)

"ہماری بڑی حویلی وہ ہے کہ جو اب لکھی چند بیبٹھ نے مول لی ہے۔ اسی کے دروازے کی سنگین بارہ دری پر میری نشست تھی اور پاس اس کے ایک "کھٹیا والی حویلی" اور سلیم شاہ کے تکیہ کے پاس دوسری حویلی اور کالے محل سے لگی ہوئی ایک اور حویلی اور اس سے آگے بڑھ کر ایک کٹرہ کہ وہ "گڈریوں والا" مشہور تھا۔ اور ایک کٹرہ کہ وہ "کشمیرن والا" کہلاتا تھا۔ اس کٹرے کے ایک کوٹھے پر میں پتنگ اڑاتا تھا۔ اور راجہ بلوان سنگھ سے پتنگ لڑا کرتے تھے۔"

یہ بڑی حویلی جس کے صدر دروازہ کی بارہ دری پر میرزا کی نشست رہتی تھی اب بھی پیپل منڈی آگرہ میں موجود ہے۔ اسی کا نام کالا (یا کلاں) محل ہے۔ یہ نہایت عالی شان عمارت ہے۔ یہ کسی زمانے میں راجہ گج سنگھ کی حویلی کہلاتی تھی۔ راجہ گج سنگھ جودھپور کے راجہ سورج سنگھ کے بیٹے تھے اور عہد جہانگیری میں اسی مکان میں رہتے تھے۔ میرا خیال ہے کہ میرزا کی پیدائش اسی مکان میں ہوئی ہوگی کیونکہ خواجہ غلام حسین خاں کا اصل سکونتی مکان یہی تھا۔ آج کل (۱۹۳۸ء) یہ عمارت ایک ہندو سیٹھ کی ملکیت ہے اور اس میں لڑکیوں کا مدرسہ ہے۔ اس کے علاوہ جس جائداد کے نام اس خط میں آئے ہیں اس میں سے بھی بہت سی اب تک اسی طرح موجود ہے جیسی غالبؔ کے بچپن کے زمانے میں تھی۔

میرزا عبداللہ بیگ خاں اپنی سسرال میں "میرزا دولھا" کے عرف سے مشہور تھے۔ ان کی حیثیت خانہ داماد کی تھی اور ان کی بیوی آخر تک اپنے میکے ہی میں رہیں۔ یوں بھی میرزا عبداللہ بیگ خاں کا اپنا کوئی مستقل ٹھکانا تو تھا نہیں، جہاں وہ جاتیں۔ جیسا کہ ذکر ہوا، ان کی وفات راؤ راجہ بختاور سنگھ والیِ الور کی ملازمت میں ہوئی۔ مولانا حالی لکھتے ہیں:۔[1]

"راجہ بختاور سنگھ نے ابھی ان کو کوئی خاطر خواہ نوکری نہیں دی تھی، کہ اتفاق سے انھیں دنوں میں ایک گڑھی کے زمیندار راج سے پھر گئے۔ جو فوج اس گڑھی پر سرکوبی کے لئے بھیجی گئی اس کے ساتھ میرزا عبداللہ بیگ خاں کو بھی بھیجا گیا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ان کے گولی لگی اور وہیں ان کا انتقال ہوگیا۔ اور راج گڑھ میں دفن ہوئے۔ راجہ بختاور سنگھ رئیس الور نے دو گاؤں سیر حاصل اور کسی قدر روزینہ میرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا۔ جو ایک مدت دراز تک جاری رہا۔"

یہ حادثہ ۱۸۰۲ء میں پیش آیا۔[2] میرزا نے ۱۸۶۰ء میں ایک قصیدہ

---

[1] یادگارِ غالب صفحہ ۱۱

[2] کلیات نثر صفحہ ۱۵۴ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

راجہ شیودھیان سنگھ والیٔ الور کی مدح میں لکھا تھا۔ اس میں اپنے حقوق جتانے کے لیے، ایک شعر میں اسی واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں ؎

در خاکِ راج گڑھ پدرم را بود مزار کافی بود مشاہدہ شاہد ضرور نیست

ولادت میرزا غالبؔ ۸ رجب ۱۲۱۲ھ[۱] (۲۷ دسمبر ۱۷۹۷ء) کی رات کو آگرہ[۲] میں پیدا ہوئے۔ ان کا پورا نام اسد اللہ بیگ خاں تھا۔ اگرچہ وہ مشہور صرف اسد اللہ خاں کے نام سے ہوئے۔

ان کے والد کا عرف "میرزا دولھا" تھا۔ ان کا "میرزا نوشہ" ہوا۔ ان سے بڑی ایک بہن تھیں جن کا نام یا عرف چھوٹی خانم تھا[۳]۔ اور

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۵ (بنام نواب علاء الدین احمد خاں)، خطوطِ غالبؔ (۱: ۳۲۷)

[۲] کلیات نثر صفحہ ۱۹۴، درفشِ کاویانی صفحہ ۱۳۱

[۳] اس نام سے مجھے شبہہ ہوتا ہے کہ میرزا غالب کی والدہ عزت النساء بیگم اپنے میکے میں بڑی خانم کے عرف سے مشہور تھیں۔

چھوٹی خانم صاحبہ کی شادی حضرت سرخوش بدخشیؒ کی اولاد میں قبیلہ برلاس کے ایک شخص میرزا جیون بیگ کے صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے ہوئی۔ غزلیات وحشی کے دیباچہ نگار میرزا حیرت دہلوی (صفحہ ۲)، کو غلط فہمی ہوئی ہے جو انھوں نے لکھا ہے کہ میرزا جیون بیگ کے صاحبزادے میرزا اکبر بیگ سے غالبؔ کی پھوپھی کا نکاح ہوا تھا۔

(بقیہ نوٹ صفحہ ۲۴ پر ملاحظہ ہو)

ایک بھائی میرزا یوسف بیگ خاں تھے جو ان سے دو برس چھوٹے تھے۔

(صفحہ ۲۳ کا بقیہ نوٹ)

دراصل یہ حقیقی بہن تھیں۔ ہاں میرزا غالبؔ کی ایک پھوپھی کی شادی اسی قبیلہ کے ایک دوسرے شخص مبارک علی بیگ سے ہوئی تھی۔ جن کی بیٹی موتی بیگم کا نکاح میرزا اکبر علی بیگ سے ہوا، جو زمانۂ غدر میں آگرہ کے کوتوال تھے۔ ان کی اولاد آگرہ میں اب بھی موجود ہے۔ اس وقت (۱۹۳۸ء) اس خاندان کے بزرگ ترین شخص مرزا نیاز علی بیگ عرف نواب مرزا ہیں جو اکبر علی بیگ کے پوتے اور ذوالفقار علی بیگ کے صاحبزادے ہیں۔ ان کی عمر اس وقت ۷۰ سال ہے۔

یہ میرزا جیون بیگ بھی میرزا غالبؔ کے دادا کے ساتھ بدخشاں سے ہندستان آئے تھے۔ اور دونوں خاندانوں میں پہلے سے دوستانہ تعلقات تھے۔ مرزا اکبر بیگ اور چھوٹی خانم کی اولاد میں تین صاحبزادے اور ایک صاحبزادی ہوئی۔ صاحبزادوں کے نام مرزا عاشور بیگ، مرزا جواد علی بیگ عرف مرزا مغل بیگ اور مرزا عباس بیگ تھے، اور صاحبزادی کا نام امانی خانم تھا۔ غالبؔ کے اردو خطوں میں ان تینوں بھانجوں کا ذکر آیا ہے۔ مرزا عاشور بیگ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں اپنے ۱۹ سالہ بیٹے مرزا احمد بیگ کے ساتھ شہید ہوئے (اردوئے معلیٰ صفحہ ۵۵) مرزا مغل بیگ الور میں ملازم تھے اور ۱۸۵۸ء کی مقامی شورش میں دیوان اتو جان کے ساتھ یہ بھی وہاں سے نکالے گئے تھے (اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۹، بنام حکیم غلام نجف خاں) ان کی قبر مہندیوں میں شاہ عبدالعزیزؒ کے مزار کی جنوبی دیوار کے قریب ہے۔ مرزا عباس بیگ (باقی اگلے صفحہ پر)

بچپن میں میرزا غالب نے اپنی والدہ کے علاوہ اپنی ممانی کا بھی دودھ پیا تھا۔[۱]

(پچھلے صفحہ سے آگے) مدتوں سرکار انگریزی میں ملازم رہے۔ ۱۸۵۷ء میں یہ بلگرام میں ڈپٹی کلکٹر تھے اور اس کے بعد تبدیل ہو کر فرخ آباد آ گئے۔ (عود ہندی صفحہ) اور پھر ایک عرصہ تک لکھنؤ میں رہے۔ بخلاف اپنے آبائی خاندان کے اہلِ تشیع میں سے تھے۔ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۹ء) میں وفات پائی۔ اماتی خانم کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروف کے صاحبزادے مرزا علی بخش خاں سے ہوئی تھی۔ جن کے صاحبزادے غلام فخر الدین سے غالب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف کی صاحبزادی عزیز النساء بیگم منسوب تھیں۔

مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی مرحوم نے ایک مضمون خواجہ بدرالدین خاں عرف خواجہ امان مترجم بوستانِ خیال سے متعلق رسالہ اردو (دکن) کی اشاعت اپریل ۱۹۳۱ء میں لکھا تھا یہ ان کے مجموعہ مضامین کے چوتھے حصہ میں بھی شامل ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ خواجہ امان اور میرزا غالب کے اجداد کا سلسلہ ایک ہی ہے۔ اس لئے تمہید میں انھوں نے میرزا غالب کے خاندان کا بھی ذکر کیا ہے۔ نہ صرف یہ دعویٰ ہی صحیح معلوم نہیں ہوتا بلکہ اس مضمون میں انھوں نے واقعات اور سنین کی اتنی فاش غلطیاں کی ہیں کہ اس مختصر تحریر میں ان کا شمار کرانا بھی مشکل ہے۔ جہاں تک خواجہ امان کا تعلق ہے، یہ بہترین مضمون ہے اور کیوں نہ ہوتا۔ لکھنے والے مرزا فرحت اور خواجہ امان ان کے نانا۔ ان سے بہتر اس موضوع پر کون لکھ سکتا تھا۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ غالب کی ہمشیرہ چھوٹی خانم کے شوہر مرزا اکبر بیگ جناب مرزا فرحت اللہ بیگ کے پردادا مرزا افضل بیگ کے بھائی تھے۔

(باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

[۱] دیکھیے صفحہ ۲۶

چچا کی سرپرستی میرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد ان کے بچوں کی دیکھ بھال کا بیڑہ ان کے چھوٹے بھائی میرزا نصراللہ بیگ خاں نے اُٹھایا۔ ان کی شادی فخر الدولہ دلاور الملک نواب احمد بخش خاں بہادر رستم جنگ والیٔ لوہارو کی ہمشیرہ سے ہوئی، لیکن کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی کہ بیوی کی وفات ہوگئی۔ اب بڑے بھائی کی وفات کے بعد انھوں نے ان کے بچوں کو ایسے نازونعم سے پالا جیسے یہ ان کی اپنی حقیقی اولاد ہو۔

میرزا نصراللہ بیگ خاں انگریزی عملداری سے پہلے مرہٹوں کی طرف سے اکبرآباد کے صوبہ دار تھے۔ ۱۸۰۳ء میں جب لارڈ لیک نے اس علاقے پر چڑھائی کی، تو میرزا نصراللہ بیگ نے ہتھیار ڈال دیے اور لڑائی بھڑائی کے بغیر شہر حوالے کر دیا اس کا خوشگوار اثر ہوا اور ممکن ہے، کہ پہلے سے کچھ سمجھوتا بھی ہو گیا ہو۔ اس کے علاوہ نواب احمد بخش خاں کا بھی انگریزوں کے ہاں اچھا اثر تھا۔ انھوں نے کئی

(پچھلے صفحے سے آگے) میرزا افضل بیگ بہت بااثر شخص تھے۔ وہ بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی کی طرف سے کلکتہ میں انگریزوں کے ہاں سفیر تھے۔ غالب کے فارسی خطوں میں میرزا افضل بیگ کا اکثر ذکر آیا ہے اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ پنشن کے مقدمے میں اپنی ناکامیوں اور مشکلوں کے لیے، انھیں بھی ذمہ دار گردانتے تھے۔

(متفرقات غالب۔ صہ ۵، ۶، ۱۰)

صفحہ ۲۷ کا لہ اردوئے معلیٰ صہ ۲۲۳ (بنام انور الدولہ شفق)، خطوطِ غالب (۱: ۱۳۶)

معرکوں میں لارڈ لیک کی نمایاں خدمات سرانجام دی تھیں اور لارڈ لیک ان کو بہت مانتے تھے۔ نئے مفتوحہ علاقے کا انتظام بھی لارڈ لیک ہی کے ہاتھ میں تھا۔ اس لئے یقین ہے کہ نواب احمد بخش خاں نے بھی سفارش کی ہوگی۔ غرض انگریزی انتظام میں اکبرآباد کا صوبہ تو کمشنری میں تبدیل ہوگیا اور کمشنر کوئی انگریز مقرر ہوا۔ لیکن لارڈ لیک نے میرزا نصراللہ بیگ خاں کی خدمات کے اعتراف میں انھیں انگریزی فوج میں چار سو سوار کا رسالدار بنا دیا اور سترہ سو روپیہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اس کے بعد میرزا صاحب موصوف نے خود سونک اور سونسا — لاکھ ڈیڑھ لاکھ سالانہ آمدنی کے دو زرخیز اور سیر حاصل پرگنے، جو بھرت پور کے قریب تھے، ریاست ہلکر کے سپاہیوں سے چھین لئے اور ان پر قبضہ جما لیا۔ جرنیل لیک کو جب یہ حال معلوم ہوا، تو انھوں نے یہ دونوں پرگنے بھی ان کو حین حیات جاگیر میں دے دیئے۔[۱]

مگر افسوس، کہ اس جاہ و مرتبت سے لطف اندوز ہونا ان کی قسمت میں نہیں لکھا تھا۔ سال بھر مشکل سے گذرا ہوگا، کہ بڑے بھائی کی وفات کے کم و بیش پانچ سال بعد ۱۸۰۶ء میں وہ بھی ایک معرکہ میں لڑتے ہوئے ہاتھی سے گر کر جاں بحق ہوئے[۲]۔ اور یوں میرزا غالبؔ

---

[۱] احوالِ غالب صفحہ ۲۷، ۲۸، اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶، مکاتیب غالبؔ صفحہ ۸ (متن)

[۲] احوال غالب صفحہ ۲۸

اوران کے بھائی میرزا یوسف ایک بار پھر یتیم اور تنہا رہ گئے میرزا غالب کی عمر اس وقت صرف آٹھ برس اور چند ماہ تھی۔

پنشن نواب احمد بخش خاں کو میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی جوانامرگی کا افسوس ہونا ہی چاہیے تھا۔ انھیں ان چھوٹے چھوٹے بچوں پر خاص طور پر رحم آیا۔ جو چچا کی وفات کے بعد اب بالکل بے کس ہو کر رہ گئے تھے۔ چنانچہ انھوں نے لارڈ لیک سے سفارش کی اور وہاں سے پنشن کا انتظام ہو گیا۔

نواب احمد بخش خاں کو اپنی خدمات کے انعام میں سرکار انگریزی کی طرف سے میوات میں فیروز پور جھرکہ اور مضافات ہوڈل (تحصیل فیروز پور جھرکہ) میں نگینہ اور پونا ہانا وغیرہ کی جاگیر بطور استمرار عطا ہوئی تھی اور چوں کہ وہ ریاست الور کے وکیل تھے اس لئے مہاراجہ بختاور سنگھ والیِ الور نے اپنی طرف سے انھیں لوہارو کا پرگنہ دے دیا تھا جو اس سے پہلے الور ہی کا ایک حصہ تھا۔ فیروز پور جھرکہ کی استمراری جاگیر سے متعلق یہ طے پایا تھا کہ اس کے لئے نواب احمد بخش خاں سرکار انگریزی کو پچیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔

میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر ان کی حینِ حیات جاگیر سونک اور سونسا انگریزوں نے واپس لے لی اور رسالہ بھی توڑ دیا۔ البتہ ان میں سے پچاس سواروں کا ایک دستہ نواب احمد بخش خاں (اور نواب نجابت علی خاں والیِ جھجر) کو دے دیا گیا کہ وہ اسے برقرار

رکھیں۔ سرکار انگریزی کو جب ضرورت ہوگی، وہ ان سے مدد طلب کرلے گی۔ اس دستے کے اخراجات اور میرزا نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندگان کی پنشن کے لیے، ۴۔ مئی ۱۸۰۶ء کو یہ حکم جاری ہوا کہ نواب احمد بخش خاں اپنی جاگیر کے لیے، جو پچیس ہزار روپیہ سالانہ دیتے ہیں، وہ اس شرط پر معاف کیے جاتے ہیں کہ آئندہ پندرہ ہزار وہ اس دستے کی غور و پرداخت پر خرچ کریں اور باقی دس ہزار میرزا مرحوم کے خاندان کو بطور پنشن ادا کریں۔

نہ معلوم کیسے مگر اس فیصلے کے ایک ہی مہینہ بعد، ۷ جون ۱۸۰۶ء کو نواب احمد بخش خاں نے ایک شقہ حاصل کرلیا جس میں یہ درج تھا کہ میرزا نصراللہ بیگ خاں کے متعلقین کو پانچ ہزار روپیہ سالانہ حسبِ ذیل تفصیل سے ادا کیا جائے:[1]

---

[1] میں نے اوپر لکھا ہے کہ میرزا غالبؔ کی ہمشیرہ ان سے بڑی تھیں۔ میں نے یہ استدلال اسی حکم سے کیا ہے۔ کیوں کہ اس جگہ پنشن کے حصہ داروں میں چھوٹی خانم کا کوئی ذکر نہیں۔ اس لیے، میرا خیال ہے کہ اس وقت ان کی شادی ہو چکی تھی۔ اگر وہ میرزا غالبؔ سے دو برس بھی بڑی ہوں، جو بعید از قیاس نہیں۔ تو ۱۸۰۶ء میں ان کی عمر گیارہ برس کی ہوگی۔ اور اس عمر میں شادی ہو جانا غیر ممکن نہیں۔ خود میرزا غالبؔ کی جب شادی ہوئی ہے، تو ان کی بیوی کی عمر صرف گیارہ برس کی تھی اور ان کی اپنی تیرہ برس کی۔

(۱) خواجہ حاجی[1] ـــــ دو ہزار روپیہ سالانہ

(۲) میرزا نصراللہ بیگ خاں کی والدہ اور تین بہنیں ـــــ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ۔

(۳) میرزا نوشہ اور میرزا یوسف برادرزادگان میرزا نصراللہ بیگ خاں مرحوم ـــــ ڈیڑھ ہزار روپیہ سالانہ۔

گویا پہلے تو دس ہزار سالانہ کے ہوئے پانچ ہزار اور پھر اس تقسیم کی رُو سے ان پانچ ہزار میں سے بھی صرف ساڑھے سات سو میرزا غالبؔ کو ملے اور ساڑھے سات سو ان کے بھائی میرزا یوسف کو۔

الور کا وظیفہ مولانا حالیؔ کے بیان کے مطابق[2] میرزا عبداللہ بیگ خاں کی وفات کے بعد راجہ بختاور سنگھ والیٔ الور نے دو گاؤں سیر حاصل (تالڑا ہ) اور کسی قدر روزینہ میرزا مرحوم کے دونوں لڑکوں کی پرورش کے واسطے مقرر کر دیا تھا۔

یہ نہیں کھلتا کہ یہ وظیفہ کب اور کیوں کر بند ہوا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرزا غالبؔ نے بعد میں اس کے دوبارہ اجراء کی کوشش کی تھی۔

---

[1] خواجہ حاجی کا ذکر آئندہ صفحات میں آئے گا کہ یہ کون بزرگوار تھے۔ یہاں صرف اتنا لکھ دینا کافی ہوگا کہ یہ ان پچاس سواروں کے افسر تھے جو چار سو کا بقیہ تھے اور نواب احمد بخش خاں کی تحویل میں دیئے گئے تھے۔

[2] یادگارِ غالبؔ (حالیؔ)، صہ ۱۱

پنج آہنگ میں ان کا ایک خط میرزا اسفندیار بیگ دیوان الور کے نام ہے۔[1] جو انھوں نے ۱۸۵۰ء میں ان کی دیوانی کے زمانے میں لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اپنے "گوشہ و توشہ" کی بحالی کا مطالبہ کیا ہے۔ بہر حال اس میں شبہ نہیں کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوئے اور ۱۸۵۰ء تک ان کا گذارہ انہی ساڑھے سات سو روپیہ سالانہ پر رہا جو انھیں انگریزی حکومت کے خزانے سے ملا کیے۔

تعلیم میرزا غالب کی ابتدائی تعلیم سے متعلق ہماری معلومات بہت کم ہیں۔ مگر اس امر کے لیے کافی شہادت موجود ہے کہ ان کی تعلیم کی طرف سے بے توجہی نہیں برتی گئی۔ ان کی تحریروں میں ہئیت۔ نجوم۔ منطق۔ فلسفہ۔ طب۔ موسیقی اور تصوف کی اصطلاحیں کثرت سے استعمال ہوئی ہیں۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان علوم میں سے بعض پر گہری نظر رکھتے تھے۔ چوں کہ والد اور چچا کی وفات کے بعد ان کا قیام اپنی ننھیال میں رہا اور یہ اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے اس لئے بجا طور پر امید کی جا سکتی ہے۔ کہ انھوں نے اپنی حیثیت کے مطابق ان کی تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام کیا ہو گا۔

مولوی محمد معظم اس زمانہ میں مولوی محمد معظم کی ذات آگرہ میں مرجع خاص و عام تھی۔ میرزا غالب نے بھی ابتدائی فارسی تعلیم انھیں سے

---

[1] کلیات نثر غالب صفحہ ۲۲۰۔

حاصل کی[1]۔ مولانا حالیؔ نے ایک دلچسپ واقعہ اس زمانے کا لکھا ہے۔ کہ میرزا غالبؔ نے ایک فارسی غزل میں "یعنی چہ" کے معنوں میں "کہ چہ" ردیف لکھی اور اپنے اُستاد کو دکھائی۔ مولوی محمد معظم نے ردیف کو مہمل کہہ دیا۔ مگر جب تھوڑے دن بعد میرزا نے ظہوری کے کلام سے اس کی سند پیش کی تو وہ اپنے ہونہار شاگرد کی خداداد ذہانت اور جدت کے قائل ہو گئے۔[2]

ملا عبد الصمد یہ واقعہ ہے کہ میرزا غالبؔ کو فارسی زبان سے قدرتی لگاؤ تھا۔ مگر اس ذوق کو چمکایا ملا عبد الصمد ایرانی نے۔ جیسا کہ میرزا نے خود لکھا ہے۔ ملا عبد الصمد ایران کے ایک امیرزادۂ جلیل القدر تھے۔ وہ یزد کے رہنے والے اور نسلاً زردشتی تھے اور اپنا آبائی مذہب چھوڑ کر اسلام پر ایمان لے آئے تھے۔ اسلام قبول کرنے سے پہلے ان کا نام ہرمزد تھا۔ وہ ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۰-۱۸۱۱ع) میں سیر و سیاحت کرتے ہندستان آئے اور اکبر آباد میں وارد ہوئے۔ میرزا غالبؔ کی عمر اس وقت چودہ برس کی تھی۔ میرزا نے انھیں دو برس تک اپنے ہاں ٹھہرایا اور ان سے تعلیم حاصل کی۔[3] ملا عبد الصمد کی مادری زبان فارسی تھی۔

---

[1] یادگارِ غالب (حالیؔ)، صہ ۱۳

[2] ایضاً صہ ۹۷

[3] لطائفِ غیبی صہ ۳۵، درفش کاویانی صہ ۱۳-۱۴

اسلام قبول کرنے سے پہلے وہ زردشتی مذہب کے پیرو تھے۔ چونکہ زردشتیوں کا تمام مذہبی سرمایہ قدیم پارسی زبان میں ہے۔ اس لئے ان کا فارسی زبان کا فاضل ہونا چنداں تعجب کا مقام نہیں۔ اس کے علاوہ وہ عربی کے بھی عالم تھے اور انھوں نے ایک مدت تک علمائے عرب و بغداد کی خدمت میں رہ کر علوم عربیہ حاصل کئے تھے۔[۱] پس گویہ سچ ہے کہ میرزا کی فارسی دانی کا سنگِ بنیاد مولوی محمد معظم کے ہاتھوں رکھا گیا تھا، لیکن اس عمارت کی تکمیل ملا عبدالصمد کے چابک دست اور ماہر ہاتھوں سے ایسے شاندار طریقے پر ہوئی کہ وہ آسمان سے باتیں کرنے لگی۔ ملا عبدالصمد نے ہندوستان سے واپس چلے جانے کے بعد بھی میرزا غالب سے خط و کتابت جاری رکھی۔[۲] مولانا حالی نے بھی لکھا ہے[۳]:-

"نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کہتے تھے کہ ملا کے ایک خط میں جو اس نے مرزا کو کسی دوسرے ملک سے بھیجا تھا یہ فقرہ لکھا تھا "اے عزیز! چہ کسی؟ کہ بایں ہمہ آزادیہا گاہ گاہ بخاطر می گزری"۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ملا عبدالصمد کو اپنے شاگرد سے واقعی محبت تھی۔ ظاہر ہے کہ انھوں نے ایسے ہونہار شاگرد کی تعلیم میں کوئی دقیقہ فروگذاشت

---

[۱] تیغ تیز (غالب)، صفحہ ۱۳، لطائف غیبی صفحہ ۳۵

[۲] درفش کاویانی صفحہ ۱۸

[۳] یادگار غالب صفحہ ۱۵

نہ کیا ہوگا۔ خود میرزا غالؔب نے بھی اپنی کتابوں میں جہاں کہیں ان کا ذکر کیا ہے، وہاں نہایت ادب کے ساتھ، محبت بھرے الفاظ میں ان کی تعلیم و تربیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ قاطع برہان کا معرکہ اس امر کی بیّن شہادت ہے کہ میرزا نے ملّا عبدالصمد کی تعلیم سے کس قدر استفادہ کیا تھا۔ وہ نہ صرف خالص پارسی زبان اور اس کی صرف و نحو بلکہ پارسی مذہب اور اس کے متعلقات پر بھی بہت حد تک حاوی ہو گئے تھے[۱]۔

بعض قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے دستور کے مطابق ان کی بسم اللہ بھی قرآن خوانی سے ہوئی تھی اور گمانِ غالب ہے کہ انھوں نے قرآنِ ناظرہ ختم کر لیا ہوگا۔ ان کے فارسی خطوں میں کہیں کہیں قرآنی آیات کے جو حوالے ملتے ہیں وہ اسی دور کی یادگار ہیں، ورنہ یوں ان کی عربی سے واقفیت بہت معمولی تھی اور مکتب میں اُنھوں نے صرف

---

[۱] مولانا امتیاز علی خاں عرشی (دیکھیے مکاتیب غالب صہ ۱۷۴ (حواشی)، اور مضمون "میرزا غالؔب کی تعلیم تحقیق و اجتہاد کے دوراہے پر" مطبوعہ رسالہ فاران (کراچی)، ستمبر ۱۹۴۹ء) اور قاضی عبدالودود صاحب (مضمون "غالؔب کا ایک فرضی استاد۔ عبدالصمد" علی گڑھ میگزین غالؔب نمبر ۱۹۴۹ء نیز احوال غالؔب)، کے خیال میں عبدالصمد کوئی تاریخی شخصیت نہیں، بلکہ غالؔب کا زائیدہ فکر ہے۔ مجھے اس نظریئے سے اختلاف ہے۔ (دیکھیے میرا مضمون "ملّا عبدالصمد۔ اُستادِ غالب" مطبوعہ نوائے ادب" (بمبئی)، جنوری ۱۹۵۲ء)

شرح مائتہ عامل تک پڑھا تھا۔[1] وہ عربی میں آخر تک غلطیاں کرتے رہے۔[2]

میاں نظیر اکبر آبادی

بعض مصنفین نے لکھا ہے کہ میرزا، نظیر اکبر آبادی کے بھی شاگرد تھے۔ میرزا کے بچپن کے زمانے میں آگرے میں نظیر کا مکتب ضرور تھا لیکن میرے خیال میں روایت اور درایت دونوں پہلوؤں سے ان کی نظیر کی شاگردی ثابت نہیں ہوتی۔

روایت کو لیا جائے تو میرزا کا ایک ہم عصر تذکرہ نگار خوب چند ذکا (متوفی ۱۸۴۶ء) ہے جس نے اپنے اُستاد شاہ نصیر کے کہنے پر تذکرہ "عیار الشعراء" مرتب کیا تھا۔ اس میں میرزا غالب کے حالات میں اس نے ان کی تعلیم سے متعلق صرف اتنا لکھا ہے: "شاگرد مولوی محمد معظم" اگر وہ نظیر کے بھی شاگرد ہوتے تو یقیناً ذکا ان کا ذکر بھی کر دیتا۔

اب درایت کو لیجیے۔

نظیر کی شاگردی کا ذکر سب سے پہلے حکیم غلام قطب الدین باطن نے اپنے تذکرہ گلستان بےخزاں المعروف بہ نغمۂ عندلیب میں کیا اور ان کی نقل میں

---

[1] رسالہ ہندستانی الہ آباد (جنوری ۱۹۳۴ء)۔ (خط بنام ڈاکٹر مولوی ضیاء الدین خاں) نیز علی گڑھ میگزین (غالب نمبر)

[2] ان کے عربی دعائے الصباح کے منظوم ترجمے سے ان کی عربی واقفیت سے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونا چاہیے۔ انھوں نے یہاں صرف فارسی نثر کا ترجمہ نظم میں کر دیا ہے۔ اور نثری ترجمہ کسی اور کا ہے۔

اوّل مولانا حسرت موہانی[1] نے اور پھر دبے لفظوں میں شیخ محمد اکرام[2] نے غالب کو نظیر کا شاگرد قرار دیا۔ مگر جن حالات میں تذکرہ گلستانِ بیخزاں، تالیف ہوا تھا، انھیں دیکھتے ہوئے، یہ روایت حد درجہ مشکوک ہو جاتی ہے۔

۱۸۳۵ء میں نواب محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ نے اپنا مشہور تذکرہ گلشنِ بیخار شائع کیا۔ اس میں جہاں مومن، آزردہ، غالب اور دوسرے ہم عصر شاعروں کی بہت تعریف کی تھی، وہیں نظیر اکبرآبادی کا ذکر کچھ ایسے انداز سے کیا کہ نظیر کے دوستوں اور شاگردوں کو بہت ناگوار گذرا۔ نظیر خود تو فوت ہو چکے تھے لیکن ان کے جواں سال صاحبزادے گلزار علی اسیر آگرے میں موجود تھے۔ انھوں نے باطن سے کہا کہ گلشنِ بیخار کا جواب لکھو۔ باطن پہلے نظیر سے اصلاح لیتے رہے تھے اور ان کی وفات کے بعد اب اسیر سے مشورہ کرتے تھے۔ استاد اور استاد زادے کی فرمائش! انھوں نے سرِ تسلیم خم کیا اور یہ تذکرہ مرتب ہوا۔ اس میں اُنھوں نے تمام ان دہلوی شعراء کی دل کھول کر مخالفت کی جن کی گلشنِ بیخار میں تعریف کی گئی تھی۔ مومن اور صاحب کے تعلق کا ذکر کیا۔ شیفتہ اور رجو کے لگاؤ کی داستان بیان کی اور غالب کو نظیر کا شاگرد لکھ دیا۔ مقصود یہ تھا کہ شیفتہ جس نظیر کو سوقیت کا مظہر بتا رہے ہیں وہ تو غالب کا استاد ہے۔ باپ کی

---

[1] شرح دیوانِ غالب (حسرت موہانی)، دیباچہ

[2] آثارِ غالب (محمد اکرام)، صہ۱۷

تعریف کرنا اور دادا کو گالی دینا یہ کہاں کا شیوۂ عقلمندی ہے۔ خود باطن کے الفاظ غمازی کر رہے ہیں کہ یہ دعویٰ محض شیفتہ کی مخالفت اور ان کے نظیر کے کلام پر اعتراض کے جواب میں وضع کیا گیا ہے ورنہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

"غالب و اسد تخلص۔ اسد اللہ خاں نام ملقب بمرزا نوشہ۔ آپ دو تخلص کرتے ہیں۔ کچھ تو سبب ہے کہ دو تخلص کرنے پر دل دھرتے ہیں....... استاد ان باشعور مثل خلیفہ معظم جو بڑے معظم و مکرم اور ہادی الشعراء (نظیر اکبرآبادی) جو بے نظیر روزگار تھے ان سے تعلیم پائی۔ ایام صباے بہ برکت انفاس متبرک ان استادوں کے بمرتبۂ علم پہنچے۔ تب ان کی فکر رسا نے یہ صورت دکھائی، کیوں نہ خوشگو ہوں جن کے استاد دو ہوں۔ چوں کہ وہ استاد مر گئے، یہ جدِ دہلی (آگرہ) سے ادھر گئے۔ اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں۔"

ذرا تیور ملاحظہ ہوں۔ آخر دو تخلص کرنے کا کیا سبب ہو سکتا ہے اور اس پر اعتراض کیوں ہو۔ لیکن پہلے تو یہی غلط ہے کہ غالب ان کی وفات کے بعد دہلی آئے۔ مولوی محمد معظم کی تاریخ وفات تحقیق نہیں ہو سکی لیکن نظیر نے یقیناً ۱۸۳۰ء میں رحلت کی۔ غالب اس سے بہت پہلے ۱۸۱۲ء کے لگ بھگ دہلی چلے آئے تھے۔ پھر آخری الفاظ "اب خواہ شاگردی سے انکار کریں یا شاید اقرار کریں" خاص طور پر قابلِ غور ہیں۔ یہ باطن کے دل کا چور ہے جو ان سے چھپ نہ سکا۔ صاف ظاہر ہے کہ انھیں خود

اپنے کہے کا یقین نہیں۔ اگر نظیرؔ کی شاگردی مسلّم تھی تو غالبؔ انکار کیوں کرنے لگے تھے۔

لیکن اصولاً نظیرؔ کی شاگردی پر کوئی اعتراض بھی نہیں، جیسا مولانا حالیؔ نے لکھا ہے۔[1]

"اگر بالفرض بچپن میں غالبؔ نے نظیرؔ کے مکتب میں تعلیم پائی ہو تو کوئی تعجب بھی نہیں۔ اس سے نظیرؔ کی عزّت زیادہ ہوتی ہے اور میرزا کی عزّت کم نہیں ہوتی۔"

لیکن ان سب استادوں سے زیادہ جس چیز نے غالبؔ پر اثر کیا وہ ان کا ماحول تھا۔ میرزا کا بچپن آگرے کے جس محلے میں گذرا، یہ گلاب خانہ کہلاتا ہے۔ اس زمانے میں گویا یہ فارسی زبان کا مرکز تھا۔ مثنوی مولانا رومؔ کے شارح ملّا ولی محمد اسی محلے میں رہتے تھے۔ مولوی شمس الضحیٰ اور مولوی بدر الدجیٰ انھیں کے بیٹے تھے۔ میر اعظم علی اعظمؔ ان کے نواسے ہوتے تھے۔ اعظمؔ نے سکندر نامہ نظامیؔ کا اردو نظم میں ترجمہ کیا تھا۔ خود بھی ایک مثنوی اکسیرِ اعظم فارسی میں لکھی۔ اعظمؔ، غالبؔ کے بچپن کے دوست تھے۔[2] اسی محلے میں مولوی محمد معظم کے علاوہ مولوی محمد کامل کا مکتب تھا۔ غرض کہ یہ ماحول سراسر علمی تھا اور ایک ذہین اور

---

[1] زندگانیٔ بے نظیر (پروفیسر شہبازؔ)، صہ ۱۹۹

[2] پنج آہنگ میں ایک خط ان کے نام موجود ہے۔ دیکھئے کلیاتِ نثرِ غالبؔ، صہ ۱۰۲-۱۰۳

طبّاع اور تیز فہم آدمی اس سے جو کچھ حاصل کر سکتا تھا وہ غالبؔ کے حصّے میں بھی آیا۔

نوجوانی کی رنگ رلیاں میرزا غالبؔ کی عمر نو برس سے کم تھی۔ جب ان کے چچا کا انتقال ہوا۔ گویا اب سر پر کوئی ایسا شخص نہ رہا جو ان کی غور و پرداخت میں دلچسپی لیتا۔ وہ اپنی والدہ کے پاس ننھیال ہی میں رہتے تھے اور وہی ان کے خرچ وغیرہ کی کفیل تھیں۔ ان کے نانا مرزا غلام حسین خاں اگرچہ ان کی جوانی تک زندہ تھے[1] مگر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے نواسے سے کبھی باز پرس نہیں کی۔ روپیہ پیسہ کی افراط اور آزادی، اس پر جوانی دیوانی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں اگر غالبؔ بھی اپنے زمانے کے رئیسوں کی روش کے مطابق راہ راست سے بھٹک گئے اور لہو و لعب میں پڑ گئے، تو کچھ تعجب کا مقام نہیں۔ تعجب تو جب ہوتا کہ وہ اتنی آزمائشوں کے ہوتے ہوئے بھی دامن بچا کر نکل جاتے۔

انھوں نے اس زمانہ کی رنگ رلیوں کی طرف اپنی تحریروں میں کئی جگہ اشارہ کیا ہے۔ کہیں فرومایوں اور اوباشوں کی ہم نشینی کا ذکر ہے تو کسی جگہ "فسق و فجور اور عیش و عشرت میں انہماک" کا۔ ایک خط میں "شورِ سودائے پری چہرگاں" کا افسانہ ہے تو دوسرے میں "تخم تجشیہ

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶۴ (بنام منشی شیونرائن)، خطوطِ غالب (۱: ۳۸۰)

ڈومنی" کا[1]۔ مگر جیسا کہ انھوں نے لکھا ہے۔ اس معاملے میں ان کا نظریہ مصری کی مکھی کا تھا نہ کہ شہد کی مکھی کا۔ یعنی انھوں نے مرض کو مزمن صورت اختیار نہیں کرنے دی اور سارا معاملہ دل لگی کی حد سے آگے نہیں بڑھنے پایا۔ بارے رندی و سیہ مستی کی یہ گھنگور گھٹائیں چوبیس پچیس برس کی عمر سے پہلے ہی پہلے موسلا دھار برس کے کھُل گئیں۔ وہ جلد ہی راہ راست پر آ گئے، اور ان کی بیشتر بری عادتیں بھی دور ہو گئیں۔ البتہ شراب نوشی کی عادت مرتے دم تک نہ چھُٹی۔

شاعری کی ابتدا

ابھی وہ مولوی محمد معظم کے مکتب میں پڑھتے تھے اور ان کی عمر دس گیارہ برس سے زیادہ نہیں تھی[2]۔ کہ انھوں نے شعر کہنا شروع کیا۔ اگرچہ اس زمانہ کی ایک فارسی غزل کا بھی پتہ چلتا ہے۔ مگر شروع میں ان کی توجہ زیادہ تر اردو ہی کی طرف رہی اور وہ بھی بیدلؔ، اسیرؔ اور شوکتؔ کے رنگ میں۔ پچیس برس کی عمر تک تقریباً دو ہزار شعر کا ایک دیوان تیار ہو گیا۔ اگر یہی روش رہتی تو ان کی ادبی موت میں کسے شبہہ ہو سکتا تھا۔ لیکن غنیمت ہے کہ ان کی خداداد

---

[1] "ڈومنی" کے لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہیے، یہ ڈوم کی مؤنث نہیں بلکہ اس سے مراد طرحدار، بانکی، ترچھی عورت ہے۔

[2] کلیات نثر صفحہ ۲۴۹ (بنام سلطان محمد بہادر میسوری)، نیز دیکھیے، یادگارِ غالب صفحہ ۹۷ (حاشیہ)

صلاحیت نے ان کی رہنمائی کی۔ انھوں نے یہ راہ ترک کر دی اور اس دیوان کو بھی نظری کر دیا۔ اس طرح گویا انھوں نے میر تقی میرؔ کی پیش گوئی پوری کر دی[1] کہ "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل استاد مل گیا اور اس نے اس کو سیدھے رستے پر ڈال دیا، تو لاجواب شاعر بن جائے گا ورنہ مہمل بکنے لگے گا۔" یہ کامل استاد ان کی اپنی طبع سلیم تھی یا بعض مخلص سخن شناس دوست، ورنہ شاعری میں وہ صحیح معنوں میں تلمیذ الرحمٰن تھے اور کسی کی شاگردی کا بارِ احسان ان کے سر پر نہیں[2]۔

مولانا حالیؔ کا بیان ہے کہ مبارز الدولہ نواب حسام الدین حیدر خاں نامی (شاگرد میر مستحسن خلیق و میر تقی میرؔ) نے غالبؔ کی غزل میرؔ کو دکھائی تو انھوں نے مندرجہ بالا رائے ظاہر کی۔ یہاں غور کے قابل یہ بات ہے کہ میرؔ کی وفات ۲۰۔ ستمبر ۱۸۱۰ء (۲۰۔ شعبان ۱۲۲۵ھ) کو ہوئی[3] اور یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دو تین برس میں لکھنؤ سے باہر کہیں نہیں گئے۔ پس ظاہر ہے کہ نواب حسام الدین حیدر خاں نے لکھنؤ ہی میں انھیں غالبؔ کی کوئی غزل دکھائی ہوگی جس پر انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا۔ میرؔ کی وفات کے وقت

---

[1] یادگارِ غالبؔ صہ ۹۸

[2] کلیاتِ نثر صہ ۱۵۵ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

[3] اردو۔ جنوری ۱۹۳۸ء صہ ۷

غالبؔ کی عمر تیرہ برس سے کم تھی اور چوں کہ اُنھوں نے دس گیارہ برس کی عمر میں شعر کہنا شروع کیا اس لیے، دوسرے لفظوں میں اس وقت ان کی شاعری کی عمر دو ڈھائی برس کی ہوگی۔ اتنی کم عمر کے ایک لڑکے کا کلام، ایک شہر سے دوسرے شہر لے جانا بجائے خود حیرت ناک بات ہے اور پھر اسے شاعری کے مرکز لکھنؤ میں لے جا کے خدائے سخن میرؔ کے سامنے رائے کے لیے، پیش کر دینا تو اس سے بھی زیادہ حیرت ناک اور اپنی قسم کا واحد واقعہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات، اس نہایت ابتدائی زمانے میں بھی ایسے اربابِ نظر کی کمی نہیں تھی جو میرزا کے کلام کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے اور اسے ایک جگہ سے دوسری جگہ بطور تحفہ لے جانے کے قابل سمجھتے تھے۔[1]

---

[1] مولانا غلام رسول مہرؔ نے اپنے مضمون "میرزا غالبؔ اور میر تقی میرؔ (مطبوعہ ماہِ نو، کراچی، فروری ۱۹۴۹ء) میں اس روایت کی صحت سے انکار کیا ہے۔ ان کے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ (۱) اس کم عمری میں میرزا کا کلام آگرے سے لکھنؤ پہنچا کیسے؟ اور اسے وہاں لے کون گیا؟ اور اس کی ضرورت ہی کیوں محسوس ہوئی؟ اور (۲) میرؔ اپنی عمر کے آخری دو تین برس مختل الحواس رہے اور چوں کہ ان کے یہ ایام بہت "سوادِ خفتگیٔ حواس اور ہجومِ امراض" میں گزرے، اس لیے، وہ کوئی ایسی رائے ظاہر کرنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ یہ استدلال حد درجہ کمزور ہے

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

شادی اور دہلی میں آمد

خاندان لوہارو سے غالب کے تعلقات کی طرف سرسری اشارہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ مگر ۱۲۲۵ھ میں ان تعلقات کی استواری کی ایک اور تقریب

(پچھلے صفحہ کا بقیہ) یہ کس نے کہا ہے کہ کلام ضرور آگرے سے گیا۔ میرزا کے تعلقات نواب احمد بخش خاں کے خاندان سے معلوم ہی ہیں۔ وہ سات برس کی عمر سے یہاں دہلی میں آتے جاتے رہے اور ان ایام میں وہ لازماً نواب صاحب ہی کے یہاں ٹھہرتے ہوں گے۔ نواب صاحب کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خاں معروف بہت اچھے شاعر تھے۔ ناممکن ہے کہ انھوں نے میرزا کا یہ ابتدائی کلام نہ سُنا ہو۔ نواب حسام الدین خاں نامی اور معروف کے "گہرے دوستانہ تعلقات" مہر صاحب کو بھی تسلیم ہیں۔ نامی نے میرزا کا کلام یہیں دہلی میں خود میرزا سے لیا یا معروف سے اور اس کی "ندرت و غرابت" کے پیشِ نظر اسے لے جا کے لکھنؤ میں اپنے استاد میر کو دکھایا کہ دیکھیے حضرت ایک ۱۲-۱۲ برس کا لڑکا ایسے شعر کہتا ہے۔

پھر میر لاکھ پریشان حال اور وارفتہ اور بیمار رہے ہوں، لیکن اتنے بھی نہیں کہ وہ شعر سُننے اور ان سے متعلق مختصر طور پر اپنی رائے تک ظاہر کرنے کے قابل نہ رہے ہوں۔ وہ کوئی مفصل تنقیدی مضمون تو لکھ نہیں رہے تھے، کہ انھیں اپنے خیالات مجتمع کر کے کافی وقت تک یکسوئی اور اطمینان سے ایک جگہ بیٹھنے کی ضرورت ہوتی۔ انھوں نے نامی سے کچھ شعر سُنے اور ایک آدھ فقرے میں اپنی رائے ظاہر کر دی۔

میری نظر میں تو اس فقرے پر بھی میر کی مخصوص چھاپ لگی ہوئی ہے۔

پیدا ہوئی۔ اس سال ۷ رجب[1] (۹ اگست ۱۸۱۰ء) کو پورے تیرہ برس کی عمر میں غالب کی شادی نواب احمد بخش خاں کے چھوٹے بھائی الٰہی بخش خاں معروف کی گیارہ سالہ صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہو گئی[2] اگرچہ ان کا دہلی میں آنا جانا سات برس کی عمر سے تھا۔ مگر شادی کے دو تین سال بعد انھوں نے دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی جسے وہ ایک جگہ یوں تعبیر کرتے ہیں[3]:

"۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکم دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی (یعنی بیوی) میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس زندان میں ڈال دیا۔"

دوسری جگہ بھی نواب علاء الدین احمد خاں ہی کو لکھتے ہیں[4]:-

"اے میری جان یہ وہ دلّی نہیں ہے جس میں تم پیدا ہوئے ہو۔ وہ

---

[1] اردوئے معلّٰی صفحہ ۲۹۵ (بنام نواب علاء الدین احمد خاں)، خطوط غالب (۱: ۳۲۷)

[2] اس کے بعد معروف کے صاحبزادے علی بخش خاں کی دوسری شادی غالب کی بھانجی امانی خانم سے ہوئی۔ انھوں نے کلیات نثر (غالب)، کے دیباچہ میں جہاں لکھا ہے کہ "درمیانِ ایں نحیف وآں سخنورِ یکتا (غالب) از دو سو پیوند قرابت استوار است" تو انہی دونوں رشتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

[3] اردوئے معلّٰی صفحہ ۲۹۵ (بنام نواب علاء الدین احمد خاں)، خطوط غالب (۱: ۳۲۷)

[4] اردوئے معلّٰی صفحہ ۳۱۸، خطوط غالب (۱: ۳۳۶)

دلّی نہیں ہے جس میں تم نے علم تحصیل کیا ہے۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں
تم شعبان بیگ کی حویلی میں مجھ سے پڑھنے آتے تھے۔ وہ دلّی نہیں ہے
جس میں سات برس کی عمر سے آتا جاتا ہوں۔ وہ دلّی نہیں ہے جس میں
اکیاون برس سے مقیم ہوں"

اس خط پر ۱۸۶۳ء کی تاریخ ثبت ہے۔ گویا مرزا غالبؔ اکیاون برس پہلے ۱۸۱۲-۱۸۱۳ء میں آگرہ سے دہلی چلے آئے تھے۔ اور صحیح بھی یہی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ انھوں نے دوسری جگہ صاف لکھا ہے کہ ملا عبدالصمد ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۰-۱۸۱۱ء) میں واردِ اکبرآباد ہوئے اور میں نے انھیں دو برس اپنے ہاں مہمان رکھا۔[1] وہ ملا عبدالصمد کو آگرہ سے ساتھ لے کر دہلی آئے اور تکمیلِ تعلیم کے بعد انھیں یہیں سے ۱۲۲۸ھ (۱۸۱۲-۱۸۱۳ء) میں رخصت کیا۔[2] اگرچہ ان کی بعض تحریروں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ پھر بھی کبھی کبھی آگرے جاتے رہے لیکن اس کے بعد ان کی مستقل سکونت دہلی ہی میں رہی۔

قیامِ دہلی کا اثر دہلی میں اگرچہ وہ علیحدہ مکان لے کر رہے مگر ظاہر ہے کہ اگر نواب احمد بخش خاں اور نواب الٰہی بخش خاں کی

---

[1] درفش کاویانی صـ۱۳

[2] یادگارِ غالبؔ (حالیؔ)، صـ۱۳

نیز اس سلسلے میں ملاحظہ ہو مکاتیب غالبؔ صـ۵۷، جہاں نواب خلد آشیاں کو لکھتے ہیں:
"برسات ایسی ہوئی ہے کہ میں باون، ترپن برس سے یہاں رہتا ہوں الخ" (یکم ستمبر ۱۸۶۶ء)

عزیز داری نے ان کا حلقۂ احباب وسیع کر دیا تھا تو یہ احباب بھی اونچے طبقہ کے لوگ ہوں گے۔ نواب الٰہی بخش خاں معرؔوف ایک طرف کہنہ مشق اور قادر الکلام سخنور تھے تو دوسری طرف صاحبِ حال وقال فقیر اور صوفی۔ غاؔلب جب بھی ان کے ہاں کسی مجلس میں شریک ہوئے، ہوں گے، وہاں ان کے کان میں یا شعر و سخن کی باتیں پڑی ہوں گی یا مذہب و تصوف کی۔ شعر و شاعری کی چیٹک انھیں پہلے ہی سے تھی یہاں تصوف کا بھی کچھ تجربہ ہوا۔ جس کے متعلق کسی نے کہا ہے۔ برائے شعر گفتن خوب است۔ پس اگرچہ یہ ماحول ان کے شاعرانہ مذاق کے خلاف تو نہیں تھا لیکن اس میں اتنی صلاحیت بھی نہیں تھی کہ شاعری میں جس غلط راہ کو وہ قیامِ آگرہ کے زمانے میں اختیار کر چکے تھے، اس سے انھیں ہٹا دے سکتا۔ مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ یہ گوہرِ گرانمایہ یوں ضائع ہو جائے۔ دہلی میں غاؔلب کی ملاقات مولوی فضل حق خیر آبادی سے ہوئی اور دونوں کے تعلقات نہایت گہرے اور دوستانہ ہو گئے۔ مولوی صاحب موصوف آخری دور کے فاضلِ اجل اور امامِ معقولات ہونے کے علاوہ شعر و سخن کا بھی نہایت پاکیزہ ذوق رکھتے تھے۔ انھوں نے غاؔلب کو ان کی بے راہ روی پر متنبہ کیا۔ خوش قسمتی سمجھئے کہ غاؔلب کے دل میں ان کی وقعت تھی اور وہ ان کے خلوص اور پایۂ سخن سنجی کو مانتے تھے۔ ورنہ کیا بعید تھا کہ جیسے انھوں نے اس سے پیشتر اکثر لوگوں کی نکتہ چینی کی پروا نہیں کی تھی اُسی طرح ان کی بات کو بھی قابلِ توجہ نہ سمجھتے۔ مولوی فضل حق

اور ایک دوسرے دوست مرزا خانی کوتوال ہی کے کہنے پر غالب نے اپنے پہلے اردو دیوان کا وہ انتخاب کیا جو اب متداول ہے اور جسے ہم بقول مولانا محمد حسین آزاد عینک کی طرح آنکھوں سے لگائے پھرتے ہیں۔

اخلاقی اصلاح

اگر مولوی فضل حق اور ان کے رفقا کی صحبت کا فقط اتنا ہی اثر ہوتا کہ وہ شاعری میں اپنی غلط روش کو چھوڑ کر ایک معتدل راہ پر آجاتے تو یہ بھی کچھ معمولی بات نہیں تھی۔ مگر اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر کام غالب کی اخلاقی اصلاح کا ہوا۔ ان کی اس زمانے کی اخلاقی حالت کا ذکر ہو چکا ہے۔ اگر وہ اسی ڈگر پر قائم رہتے تو اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ان کے دل و دماغ کا کیا حشر ہوتا۔ مگر شکر ہے کہ کچھ معروف کی عزیزداری اور کچھ مولوی صاحب موصوف اور اسی وضع کے دوسرے احباب کی دینداری کا یہ اثر ہوا کہ وہ سنبھل گئے۔ اس زمانے میں دہلی ایک بہت بڑے مذہبی بحث و مباحثے کا میدان بنا ہوا تھا۔ شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ وہابیت اور عدم تقلید کے اصول کے علم بردار تھے اور مولوی فضل حق حامیانِ تقلید کے قافلہ سالار۔ تمام دہلی ان دو دھڑوں میں منقسم ہو گیا۔ غالب بھی اس ہنگامے کی لپیٹ سے نہ بچ سکے۔ چونکہ مولوی فضل حق ان کے عزیز دوست تھے، اس لئے، انھیں مجبوراً ان کا ساتھ دینا پڑا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں ان کا اپنا نقطۂ نظر دوسرے فریق کے اصولوں سے

زیادہ قریب تھا۔ انھوں نے مولوی صاحب ہی کے کہنے پر ایک فارسی مثنوی بھی "امتناعِ نظیرِ خاتم النبیین" کے نظریے سے متعلق لکھی[1]۔ اول اول اس میں بھی انھوں نے اپنی فطری سلامت روی کے اقتضا سے وہی کچھ لکھا جو اصولاً صحیح تھا۔ مگر وقتی مصلحتیں دائمی صداقت پر غالب آئیں اور بعد میں مولوی صاحب کے کہنے پر انھیں اس میں ردوبدل کرنا پڑا[2]۔

---

[1] یہ ہنگامہ اس طرح شروع ہوا کہ مولوی شاہ محمد اسمٰعیلؒ نے اپنی مشہور کتاب "تقویت الایمان" میں، جو شرک کے رد میں ہے اور جس میں شرک کی مختلف اقسام کا بیان ہے، یہ فرمایا کہ خدا کی "یہ شان ہے کہ ایک آن میں ایک حکمِ کن سے چاہے تو کروڑوں نبی و ولی ..... اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے برابر پیدا کر ڈالے۔" (صفحہ ۲۲) مولانا فضل حق خیرآبادی ان دنوں دہلی میں ناظرِ دیوانی تھے۔ انھوں نے اعتراض کیا کہ یہ اللہ تعالیٰ اور رسولِ کریمؐ پر افترا ہے۔ شاہ محمد اسمٰعیلؒ نے قرآن کی آیت سے جواب دیا:

أَوَلَيْسَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِقَادِرٍ عَلَىٰ أَنْ يَخْلُقَ مِثْلَهُمْ بَلَىٰ وَهُوَ الْخَلَّاقُ الْعَلِيمُ

(یٰس، ۳۶: ۸۱)

کیا وہ ذات جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، اس پر قادر نہیں کہ انکی مانند کوئی اور پیدا کر سکے۔ کیوں نہیں وہ سب سے بڑا پیدا کرنے والا اور جاننے والا ہے۔

[2] یادگارِ غالب صفحہ ۱۷۔ یہ کلیاتِ نظم فارسی کی چھٹی مثنوی ہے اور اسکا عنوان ہے: "بیان نموداریِ شانِ نبوت و ولایت کہ در حقیقت پرتوِ نور الانوارِ حضرت الوہیت است۔"

ان تمام باتوں کا یہ اثر ہوا کہ غالب نے اپنی آزادانہ زندگی ترک کر دی۔ اگرچہ وہ اب بھی کبھی کبھی "روزِ ابر" اور "شبِ ماہتاب" میں شراب نوشی تو کر لیتے تھے اور آخر تک کرتے رہے۔ مگر اب وہ پہلا سا غیر معتدل طریقہ موقوف ہو گیا۔ ان میں مذہبیت کا عنصر پیدا ہو گیا۔ اس سے پہلے ان کی مہر پر کندہ تھا: "اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ" مگر اب جو نئی مہر انھوں نے ۱۲۳۸ھ میں تیار کروائی۔ اس پر کندہ ہے "محمد اسد اللہ خاں"۔ یہ دونوں مہریں جس عظیم الشان ذہنی انقلاب کی شاہد ہیں، اس کی تشریح الفاظ میں نہیں کی جا سکتی۔[1]

مالی پریشانیوں کا آغاز

غالب جب تک آگرے میں رہے، انھیں خرچ کی کوئی تنگی نہیں ہوئی۔ بلکہ سچ یہ ہے کہ روپے پیسے کی افراط تھی۔ اس لئے انھیں اپنے ع "شاہد و شمع و شراب و شکر و نالے و سرود" کے ذوق کی تسکین کے لئے کسی پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ پھر جب دہلی آئے تو یہاں بھی چندے یہی رنگ رہا۔

---

[1] غالب نے اپنی عمر میں چھ مہریں بنوائیں (۱) اسد اللہ خاں عرف میرزا نوشہ (۲) اسد اللہ الغالب (۳) محمد اسد اللہ خاں (۴) رَضِینَا قِسمَۃَ الجَبّارِ فِینَا۔ لَنَا عِلمٌ و للجُہّالِ مَالٌ۔ اسد اللہ خاں غالب (۵) نجم الدولہ دبیر الملک، نظام جنگ۔ (۶) غالب ـــــ ان سے متعلق میرا ایک مفصل مضمون "ادبی دنیا" لاہور (اپریل، ۱۹۴۱ء) میں شائع ہو چکا ہے۔

ساڑھے سات سو پنشن کے نواب احمد بخش خاں سے ملتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی وہ سلوک کرتے رہتے تھے۔ الور سے بھی کچھ نہ کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ والدہ زندہ تھیں وہ بھی گاہے ماہے آگرہ سے بھیجتی رہتی تھیں۔ مگر یہ صورتِ حالات جلد ہی بدل گئی۔

نواب احمد بخش خاں نے ۱۸۲۲ء میں سرکارِ انگریزی اور الور دربار کی منظوری اور اپنے خاندان کی رضامندی سے اپنی جائداد کی یوں تقسیم کی، کہ ان کے بعد فیروز پور جھرکہ کی گدی پر ان کے بڑے بیٹے شمس الدین احمد خاں بیٹھیں۔ جو ان کی میواتی حرم مُدّی عرف بہو خانم کے بطن سے تھے اور لوہارو جاگیر ان کے دونوں چھوٹے صاحبزادوں امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کو ملے، جو ان کے ہم کُفو خاندان کی بیاہتا بیوی بیگم جان[۵۱] کی اولاد تھے۔ چوں کہ بھائیوں میں آپس میں کشمکش تھی اور خاندان کے دوسرے افراد بھی شمس الدین احمد خاں کو پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے نواب احمد بخش خاں نے بعد میں خیال کیا کہ کہیں ایسا نہ ہو، میری موت کے بعد جھگڑا ہو جائے اور شمس الدین احمد خاں وصیت کے خلاف اپنے چھوٹے بھائیوں کا

---

۵۱ بیگم جان صاحبزادی تھیں نیاز محمد بیگ کی۔ بعد میں ان کے خاندان کو لوہارو میں کپتان فیملی کا نام دیا گیا۔ کیونکہ بیگم جان کے بھائی نذر محمد بیگ لوہارو فوج میں کپتان کے عہدے پر فائز رہے تھے۔ بیگم جان کا انتقال نومبر ۱۸۶۶ء میں ہوا۔ (اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۸۹ بنام نواب امین الدین احمد خاں)

حق غصب کرلے۔ اس لئے انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس تقسیم پر میری زندگی ہی میں عملدرآمد شروع ہو جائے۔ چناں چہ ۱۸۲۶ء میں وہ خود ریاست کے انتظام سے دست بردار ہو کر گوشہ نشین ہو گئے، شمس الدین احمد خاں فیروز پور جھرکہ کے نواب تسلیم کر لیے گئے، اور لوہارو دوسرے دونوں بیٹوں کو مل گیا۔

اس نئے انتظام کا غالب کے معاملات پر بہت گہرا اثر پڑا۔ آئندہ کے لئے ان کی پنشن نواب شمس الدین احمد خاں سے متعلق ہو گئی اور چوں کہ غالب کے تعلقات نواب کے مخالفین سے تھے۔ اس لئے پہلے تو اس کی ادائی میں طرح طرح کے روڑے اٹکائے جانے لگے اور بالآخر اپریل ۱۸۳۱ء میں یہ بالکل بند کر دی گئی۔ چناں چہ نواب شمس الدین احمد خاں کی گرفتاری (۱۸۳۵ء) تک بند رہی اور چار برس کا یہ سارا بقایا غالب کو نواب کی وفات کے بعد کہیں ۱۸۳۷ء میں وصول ہوا۔ پنشن کے علاوہ وقتاً فوقتاً جو فتوحات نواب احمد بخش خاں کی طرف سے ملا کرتی تھیں وہ بھی یک قلم بند ہو گئیں۔ قرضخواہوں نے یہ مخالف حالات دیکھ کر غالب سے اپنا روپیہ واپس مانگا اور تقاضوں سے ناک میں دم کر دیا۔ مصیبت بالائے مصیبت یہ کہ غالب کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف انھیں دنوں اٹھائیس برس کی عمر میں دیوانہ ہو گئے۔ قدرتاً غالب جنھوں نے آج تک تنگی اور پریشانی کا ایک دن نہیں دیکھا تھا، مصیبتوں کی اس یکبارگی یلغار سے گھبرا اٹھے۔

پنشن کا قضیہ ۱۸۲۶ء ہی میں ایک اور واقعہ پیش آیا، جس نے غالب کو اور زیادہ پریشان کر دیا۔ اس سال خواجہ حاجی[1] کا انتقال ہو گیا۔ یہ وہی صاحب ہیں۔ جو ۷ رجون ۱۸۰۶ء والے دوسرے

---

[1] خواجہ حاجی (یا ان کے والد خواجہ قطب الدین) غالب کے دادا قوقان بیگ خاں ہی کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ مرزا فرحت اللہ بیگ مرحوم کا دعویٰ ہے کہ وہ غالب کے جدِّ اعلیٰ ترسم خاں کے چھوٹے بھائی رستم خاں کی اولاد میں سے تھے۔ یعنی تین چار پشت اوپر غالب اور خواجہ حاجی کا سلسلۂ نسب مل جاتا ہے۔ یہ دعویٰ حد درجہ مشکوک ہے اور ان کے بیان کے علاوہ کوئی اور شہادت اس کے ثبوت میں ہمارے پاس موجود نہیں، بلکہ غالب بھی اس سے انکاری ہیں اور کہتے ہیں کہ خواجہ حاجی کا باپ میرے دادا قوقان بیگ خاں کا سائیس تھا اور اس کی اولاد دو پشت سے ہماری خانہ زاد اور تین پشت سے نمک خوار ہے۔ (متفرقات غالب صہ) اس میں شک نہیں کہ خواجہ حاجی کی شادی انہی مرزا جیون بیگ کی صاحبزادی امیر النساء بیگم سے ہوئی تھی۔ جن کے ایک صاحبزادے مرزا اکبر بیگ سے غالب کی ہمشیرہ (یعنی مرزا نصر اللہ بیگ خاں کی بھتیجی) چھوٹی خانم منسوب تھیں۔ اس کے علاوہ یہ بھی درست ہے کہ خواجہ حاجی چار سو سواروں کے اس رسالے میں ایک افسر تھے (اور ان کے علاوہ دو افسر اور تھے) جو مرزا نصر اللہ بیگ خاں کے ماتحت تھے۔ میرزا نصر اللہ بیگ خاں کی وفات پر جب یہ رسالہ ٹوٹا اور اس میں سے صرف پچاس سوار نواب احمد بخش خاں کو دیے گئے تو انھوں نے (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

حکم کی رو سے پنشن میں سے دو ہزار سالانہ کے حصہ دار تھے۔ اب ان کے انتقال کے بعد ان کا حصہ ان کے دونوں بیٹوں شمس الدین خاں عرف خواجہ جان اور بدر الدین خاں عرف خواجہ امان (مترجم بوستانِ خیال) کے نام منتقل کر دیا گیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ میرزا کو یہ توقع تھی کہ خواجہ حاجی کو یہ رقم صرف ان کی زندگی بھر ملتی رہے گی اور ان کے بعد ہمارے خاندان کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ اسی لیے اگرچہ وہ اسے شروع سے ناانصافی تو خیال کرتے رہے کہ خواجہ حاجی کو دو ہزار سالانہ ملیں لیکن اسے عارضی بات سمجھتے ہوئے اتنے دن مصلحت سے خاموش رہے تھے۔ اب ان کے مرنے کے بعد جب یہ رقم ان کے صاحبزادوں کو ملنے لگی تو وہ قدرتاً جزبز ہوئے۔

(پچھلے صفحے سے آگے) انہیں اُن سواروں کا افسر مقرر کر دیا تاکہ ان کا روزگار بنا رہے۔

ظاہر ہے کہ ان دور کی رشتہ داریوں کے خیال سے خواجہ حاجی کسی طرح میرزا نصراللہ بیگ خاں کے پس ماندگان میں شمار نہیں کیے جا سکتے۔ کہ وہ پانچ ہزار میں سے دو ہزار سالانہ کے مستحق قرار پائیں۔ نواب احمد بخش خاں نے جو کیا، واللہ اعلم، ان کی کیا نیت تھی۔ مگر آج میرزا فرحت اللہ بیگ واقعات کو توڑ مروڑ کر ہمیں یہ یقین دلانا چاہیں کہ خواجہ حاجی، غالب کے خاندان کے بزرگ اور میرزا نصراللہ بیگ خاں کے وارثِ اوّل تھے اور غالب مجوب الارث کی حیثیت رکھتے تھے، تو ہم کس طرح صاف واقعات سے آنکھیں بند کر کے ان کی مان لے سکتے ہیں۔

اُنھوں نے اس پر ناراضی اور شکایت کا اظہار کیا مگر بظاہر اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکلا۔

غالب کا خیال تھا کہ ۴ مئی ۱۸۰۶ء والی قرار داد کے بموجب ہم لوگوں کو دس ہزار روپیہ سالانہ ملنا چاہیے، کیوں کہ انھیں ۷ جون والے شقّہ کا علم ہی نہیں تھا۔ مگر آج تک اُنھوں نے اس انتظام کے خلاف کوئی عملی احتجاج نہیں کیا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ انھیں نواب احمد بخش خاں کی بزرگی کا خیال ہو، مگر اس سے بھی بڑی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نواب احمد بخش خاں کی مہربانیاں ساڑھے سات سو روپیہ ہی تک تھوڑی محدود تھیں۔ وہ اس کے علاوہ اکثر خود بھی دیتے رہتے تھے اور الور وغیرہ سے بھی دلوا دیتے تھے۔ لیکن نواب احمد بخش خاں کے گوشہ نشینی اختیار کر لینے اور نواب شمس الدین احمد خاں کے حکمران ہو جانے سے حالت بالکل بدل گئی۔ خواجہ حاجی کے حصّے کا جھگڑا تو تھا ہی، نواب شمس الدین احمد خاں کے مخالفانہ سلوک نے ان کے غصّہ کی آگ کو اور ہوا دی اور انھوں نے طے کر لیا کہ اس ناانصافی کے برخلاف سرکارِ انگریزی میں باقاعدہ شکایت کرنا چاہیے۔

البتہ آخری قدم اُٹھانے سے پہلے میرزا نے ایک بار نواب احمد بخش خاں کی خدمت میں حاضر ہو کر صلح و صفائی سے معاملہ سلجھانے کی کوشش کی۔[1]

---

[1] کلیاتِ نثر صفحہ ۹۸ (بنام میرزا علی بخش خاں)

ان کے دوستوں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ اتنے پرانے تعلقات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہیے، جس سے نواب احمد بخش خاں کو کسی طرح کا رنج ہو۔ مگر جب انھیں اس آخری کوشش میں بھی کوئی کامیابی نہ ہوئی تو انھوں نے فیصلہ کر لیا، کہ اب اس کے سوائے اور کوئی چارہ نہیں کہ کلکتہ جاؤں اور وہاں گورنر جنرل کی کونسل کے سامنے تمام حالات رکھ کر انصاف طلب کروں۔

سفرِ کلکتہ

غالب کی عمر کے ابتدائی زمانے میں آمد و رفت کے ذرائع بہت محدود تھے اور یوں بھی سفر خطرے سے خالی نہیں تھا۔ خود میرزا کی افتادِ طبیعت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ گھر گھسنے قسم کے انسان تھے اور انھیں سیر و تماشے سے زیادہ لگاؤ نہیں تھا۔ اس کے باوجود ان کی تحریروں سے ان کے اس زمانے کے بعض چھوٹے چھوٹے سفروں کا پتہ چلتا ہے۔ جب انگریزوں نے دسمبر ۱۸۲۵ء میں بھرت پور کے قلعہ پر حملہ کیا اور نواب احمد بخش خاں بھی انگریزوں کی طرف سے لڑ رہے تھے تو اس معرکے میں غالب بھی نواب کے ہم رکاب تھے۔ نواب احمد بخش خاں کی زندگی میں وہ کبھی کبھی لوہارو بھی جاتے رہتے تھے۔ یہ تو ۱۸۵۷ء سے پہلے کی بات ہے۔ اس کے بعد صرف ایک مرتبہ میرٹھ اور دو دفعہ رامپور گئے۔ ان کے ایک شعر سے[1] ایک سفر بھوپال کا بھی پتہ چلتا ہے

---

[1] پیرانہ سال غالبِ میکش کرے گا کیا بھوپال میں مزید جو دو دن قیام ہو

اگرچہ اور کسی ذریعے سے اس کی تائید نہیں ہو سکی اور نہ یہ معلوم ہوا کہ وہ کب وہاں گئے تھے۔ کم از کم ایک مرتبہ دو جانا بھی گئے۔

لیکن ان کی زندگی کا سب سے لمبا سفر وہ ہے، جب وہ اس پنشن کے مقدمے کے لئے کلکتہ گئے ہیں۔ وہ غالباً اگست ۱۸۲۶ء کے لگ بھگ دہلی سے روانہ ہوئے۔ لکھنؤ کے سخنور اور اکابر اہلِ علم حضرات انھیں ایک مدت سے اپنے ہاں آنے کی دعوت دے رہے تھے[1] لیکن میرزا کاہلی اور کم فرصتی کے باعث یہ دعوت قبول نہیں کر سکے تھے۔ اب جو دہلی سے نکلے تو کانپور سے لکھنؤ کی راہ لی۔ وہاں کے اربابِ نظر نے انھیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور ان کی مناسب آؤ بھگت کی۔ میرزا کی اردو غزل جس کا مطلع ہے ؎

وہاں پہنچ کر جو غش آتا پیہم ہے ہم کو
صدرہ آہنگِ زمیں بوس قدم ہے ہم کو

قیامِ لکھنؤ کی یادگار ہے۔ اس کے آخر میں یہ تین شعر کا قطعہ ہے ؎

لکھنؤ آنے کا باعث نہیں کھلتا یعنی
ہوسِ سیر و تماشا سو وہ کم ہے ہم کو

مقطعِ سلسلۂ شوق نہیں ہے یہ شہر
عزمِ سیرِ نجف و طوفِ حرم ہے ہم کو

لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ
جادۂ رہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو

آغا میر | ان دنوں غازی الدین حیدر شاہِ اودھ تھے لیکن سلطنت کے سیاہ و سپید کے مالک نائب السلطنت معتمد الدولہ سید محمد خاں

---

[1] یادگارِ غالب (حالی)، صہ ۲۵

بہادر عرف آغا میر تھے۔ غالب کے دوستوں نے بہ عنوانِ مناسب آغا میر تک خبر پہنچائی کہ غالب لکھنؤ میں موجود ہیں تو انھوں نے ایما فرمایا کہ وہ میرزا کی ملاقات سے خوش ہوں گے[1] میرزا بھی تیار ہو گئے کہ نائب السلطنت اودھ کے دربار میں باریابی کا فخر حاصل کریں۔ چوں کہ وقت کم تھا اور اتنی جلدی میں قصیدہ نہیں لکھا جا سکتا تھا، اس لیے انھوں نے پیش کرنے کو ایک مختصر سی فارسی نثر صنعتِ تعطیل میں لکھ لی۔ میرزا جانے پر تو راضی ہو گئے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ اوّل میرے پہنچنے پر آغا میر کھڑے ہو کر پذیرائی کریں اور دوم مجھے نقد نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جائے[2]۔ "گدا طبع، سلطان صورت" آغا میر اعزاز و اکرام کی اس حد تک جانے کو تیار نہ ہوا۔ ادھر میرزا اس سے کم کو "آئین خویشتن داری" کے خلاف اور "شیوۂ خاکساری" کے لیے ننگ خیال کرتے تھے۔ اس لیے یہ ملاقات نہ ہو سکی[3]

ورودِ کلکتہ میرزا لکھنؤ میں پانچ ماہ کے قریب ٹھہرے[4]۔ یہاں سے وہ کانپور بنارس۔ پٹنہ۔ مرشد آباد کے رستے ۱۹۔ فروری ۱۸۲۸ء

---

[1] کلیات نثر صفحہ ۶۵

[2] یادگارِ غالب (حالی) صفحہ ۲۵

[3] کلیات نثر صفحہ ۱۵۷ (بنام ینج ل)

[4] میرزا نے آغا میر کی خدمت میں پیش کرنے کو جو نثر لکھی تھی۔ (باقی اگلے صفحے کے نیچے)

(۴۔ شعبان ۱۲۴۳ھ) کو کلکتہ پہنچے۔[1] یہ سفر بیشتر گھوڑے پر ہوا۔ اگرچہ کچھ مسافت گھوڑا گاڑی اور کشتی کے ذریعے بھی طے ہوئی۔ جس دن کلکتہ پہنچے، اسی دن کسی غیر معمولی جستجو اور زحمت کے بغیر، رہنے کو مکان مل گیا۔[2] یہ شملہ بازار میں گروکے تالاب کے نزدیک میرزا علی سوداگر کی حویلی میں تھا

(پچھلے صفحے سے آگے) اس کے آخر میں اگرچہ سنہ نہیں مگر تاریخ دوم محرم الحرام درج ہے۔ (کلیاتِ نثر صفحہ ۶۵-۶۶) جب ہم دیکھتے ہیں کہ وہ نواب احمد بخش خاں کی وفات (ربیع الاول ۱۲۴۲ھ) کے زمانے میں مرشد آباد کے قرب و جوار میں تھے اور لکھنؤ سے جمعہ کے دن ۲۶ رذی قعدہ کو روانہ ہو کر ۲۹ رذی قعدہ کو کانپور پہنچے (صفحہ ۱۵۸) تو ماننا پڑے گا کہ وہ ذی قعدہ ۱۲۴۲ھ میں لکھنؤ سے کانپور گئے، اور اس سے پہلے محرم ۱۲۴۲ھ (اگست ۱۸۲۶ء) کے لگ بھگ دہلی سے روانہ ہو کر لکھنؤ پہنچے۔ گویا قیامِ لکھنؤ کا زمانہ کم از کم گیارہ ماہ ہوگا۔

لیکن خود غالب ہی نے ایک خط میں صاف لکھا ہے، کہ میں لکھنؤ میں کم و بیش پانچ ماہ ٹھہرا تھا۔ (خط بنام ابن حسن خاں مطبوعہ اردو ادب (علی گڑھ)، جولائی۔ دسمبر ۱۹۵۲ء) اس صراحت کے مقابلے میں گیارہ ماہ کے استدلال کو لازماً رد کرنا پڑے گا، کیوں کہ عین ممکن ہے کہ کلیاتِ نثر کے مطبوعہ خطوں میں سے کسی پر تاریخ غلط چھپ گئی ہو۔

[1] کلیاتِ نثرِ غالب، صفحہ ۱۳۶ (بنام مولوی محمد علی خاں)، یہاں پر تاریخوں اور دنوں میں کچھ تفاوت ہے۔ (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

مکان کھلا اور پُر فضا تھا۔ اس میں ضرورت کے تمام سامان موجود تھے۔ گوشۂ صحن میں میٹھے پانی کا کنواں تھا اور ان تمام خوبیوں اور سہولتوں کے باوجود کرایہ صرف دس روپیہ ماہانہ تھا۔[له]

یہاں پہنچ کر انھیں گورنر جنرل کی کونسل کی طرف سے جواب ملا کہ یہ مقدمہ پہلے دہلی میں انگریزی ریذیڈنٹ کے سامنے پیش ہونا چاہیے، اس کی رپورٹ پر یہاں مناسب کارروائی کی جائے گی۔ میرزا کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وہ واپس دہلی آتے اور پھر ہفتخواں طے کرکے کلکتہ پہنچتے۔

(پچھلے صفحے سے آگے) ۲له کارنوالس اسکوائر کے تالاب کے سامنے مانک ٹولا اسٹریٹ کی نکڑ پر ایک گرجا ہے جس کا نام کرائسٹ چرچ (Christ Church) ہے۔ اس گرجے کی پشت پر ایک بازار ہوا کرتا تھا، جو مانک ٹولا اسٹریٹ سے شروع ہوکر شمال کو بیڈن اسٹریٹ کی طرف چلا جاتا تھا۔ اسی کا نام شملہ بازار تھا۔ یہ بازار اس صدی کے شروع تک موجود تھا۔ اب اس کے کچھ حصے میں تو عمارتیں بن گئی ہیں اور باقی میں بیتھیون رو (Bethune Row) ہے۔ میرزا علی سوداگر کا مکان غالباً اس جگہ تھا جہاں اس وقت بیتھیون رو کا مکان ۱۳/۲ ہے۔ اس کے صحن کا کنواں ۱۹۳۵ء میں پاٹا گیا تھا۔ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ گرد کا تالاب اس جگہ تھا جہاں اب کارنوالس اسکوائر کا تالاب ہے۔

۳له کلیاتِ نثر صفحہ ۱۵۹ (بنام رائے چھج مل)

۴له ایضاً صفحہ ۹۹ (بنام علی بخش خاں)، و صفحہ ۱۲۶ (بنام مولوی محمد علی خاں)

اس لئے وہ خود تو کلکتہ ہی میں رہے اور دہلی ریذیڈنسی میں مقدمے کی پیروی کے لئے خط کے ذریعے لالہ ہیرالال کو اپنا وکیل مقرر کر دیا۔

ان دنوں دہلی میں سر ایڈورڈ کولبروک ریذیڈنٹ تھے اور منشی التفات حسین خاں ان کے میر منشی۔ میرزا نے کلکتہ سے ان دونوں کے نام سفارشی خط حاصل کئے۔ ریذیڈنٹ کے لئے کرنیل ہنری املاک سے، جو کمپنی کی فوج میں ملازم تھے اور کولبروک کے ملنے والوں میں سے تھے۔ میر منشی کے لئے خط نواب علی اکبر خاں طباطبائی متولی امام بارہ ہوگلی سے لیا۔ انھوں نے یہ دونوں خط اپنے وکیل ہیرالال کو بھیج دیئے۔ ان کوششوں اور سفارشوں کا یہ نتیجہ نکلا کہ کولبروک صاحب نے ان کے حق میں مناسب رپوٹ صدر کو بھیج دی۔[۱]

بدقسمتی سے سر ایڈورڈ کولبروک جلد ہی رشوت ستانی کے جرم میں ماخوذ ہو کر معزول ہو گئے اور ان کی جگہ فرانسس ہاکنس ریذیڈنٹ مقرر ہوئے۔ ہاکنس کا نواب شمس الدین احمد خاں سے یارانہ تھا اس نے نواب کے کہنے پر صدر میں دوسری رپوٹ بھیجی جس میں لکھا کہ غالب کو جو ساڑھے سات سو سالانہ آج تک ملتے رہے ہیں۔ وہ اس سے زیادہ کے مستحق نہیں۔[۲]

---

[۱] کلیات نثر صفحہ ۱۰۰ (بنام علی بخش خاں)، و صفحہ ۱۴۴ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

[۲] ایضاً صفحہ ۱۳۰-۱۳۱ (مولوی سراج الدین احمد) نیز متفرقاتِ غالب (بقیہ اگلے صفحہ کے نیچے)

میرزا کو پورا یقین تھا کہ چوں کہ میں سچائی پر ہوں، اس لئے مقدمے کا فیصلہ ضرور میرے موافق ہو جائے گا۔ ان دنوں حکومت انگریزی کے سکریٹری انڈریو اسٹرلنگ تھے۔[۱] انھوں نے بھی میرزا کی خاصی آؤ بھگت کی۔ دوسرے اعلیٰ انگریزی افسر بھی بہت اچھی طرح پیش آئے۔ میرزا کی طبیعت پر ان سب باتوں کا یہی اثر ہوا کہ فیصلہ ضرور میرے حق میں ہو جائے گا اور اسی امید پر وہ ڈیڑھ سال سے زیادہ کلکتے میں پڑے رہے۔ جب وہ دہلی سے روانہ ہوئے ہیں، تو اتنے شکستہ دل اور مایوس تھے کہ وہ سوچ رہے تھے کہ اب ہندوستان میں نہ رہوں بلکہ ایران چلا جاؤں اور وہیں "یزد کے آتش کدوں اور شیراز کے میخانوں" میں زندگی کے باقی دن گزار دوں۔ مگر کلکتے میں افسروں کے حوصلہ افزا سلوک اور برتاؤ نے ان کی ڈھارس بندھائی اور انھوں نے یہ ارادہ ترک کر دیا۔[۲] بلکہ کلکتہ کی فضا اور ماحول انھیں اتنا پسند آگیا تھا۔ کہ وہ کہتے ہیں، اگر میں عنفوانِ شباب میں وہاں گیا ہوتا اور شادی اور خانہ داری

(پچھلے صفحے سے آگے)، صہ ۳۱-۳۲، ہاکنس سے متعلق دو ہجویہ قطعے میرزا کے کلیات نظم فارسی میں موجود ہیں (قطعہ ۱۵ و ۱۶)

[۱] اینڈریو اسٹرلنگ کی مدح میں ایک پُرزور قصیدہ کلیات فارسی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ (قصیدہ سی و نہم)، قطعہ ۴۵ بھی انہی کی جوانا مرگی کے غم میں لکھا گیا تھا۔

[۲] کلیات نثر غالب، صہ ۱۰۳ (بنام میر اعظم علی)

کی ذمہ داریاں میری راہ میں حائل نہ ہوتیں تو مدت العمر کے لیے کلکتہ ہی میں رہ جاتا[1]

لیکن جب ایک مدت کے قیام کے بعد بھی کوئی فیصلہ نہ ہوا اور اس کے جلد صادر ہونے کی بھی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ ادھر دہلی سے ہاکنس کی مخالفانہ کوشش کی خبر پہنچی تو انھوں نے واپس آنے کا عزم کرلیا۔ اس سے نہ صرف مزید زیرباری اور خرچ کی بچت منظور تھی بلکہ انھیں یقین تھا کہ میں دہلی پہنچ کر زیادہ مفید کام کرسکوں گا، اور اپنے اثر و رسوخ کے ذریعے یہاں سے بہتر رپوٹ وغیرہ لکھوا لوں گا۔ اس لیے کلکتہ میں مقدمے کی دیکھ بھال کے لیے منشی نصراللہ کو اپنا وکیل مقرر کرکے وہ وہاں سے روانہ ہو گئے، اور تین برس کی غیر حاضری کے بعد ۲۸ نومبر ۱۸۲۹ء کو واپس دہلی پہنچے[2]

ادبی معرکہ غالب کے ایک فارسی قصیدے[3] سے معلوم ہوتا ہے کہ انھیں اس سفر میں دو ہنگامے پیش آئے، پہلا الہ آباد میں دوسرا

[1] کلیات نثر (غالب)، صفحہ ۱۲۶ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

[2] میرزا لکھتے ہیں کہ میں یکشنبہ دوم جمادی الثانی (مطابق ۲۸ نومبر) کو دہلی پہنچا۔ دوم جمادی الثانی کو دوشنبہ تھا۔ اور یکشنبہ کو یکم جمادی الثانی۔ کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۲۵ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

[3] کلیات غالب (نظم فارسی)، قصیدہ نہم در منقبت سید الشہداء علیہ السلام اس میں ایک شعر ہے ؎

نفس بلرزہ ز بادِ نہیبِ کلکتہ نگاہ خیرہ ز ہنگامۂ الہ آباد

کلکتہ میں۔ الہ آباد والے قضیہ کی تفصیل کہیں سے معلوم نہیں ہو سکی۔ ہاں کلکتہ کے معرکے سے متعلق ان کی تحریروں میں کافی تفصیل موجود ہے۔

ان دنوں کلکتہ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مدرسۂ عالیہ کے زیر اہتمام ہر انگریزی مہینے کے پہلے اتوار کو ایک بزمِ سخن منعقد ہوا کرتی تھی۔ میرزا کے پہنچنے کے بعد جو مشاعرہ ہوا[۲] اس میں انھوں نے ہمامِ تبریزی کی زمین میں غزل پڑھی جس کا یہ مقطع بہت مشہور ہے ؎

گر دہم شرح ستم ہائے عزیزاں غالب　　رسمِ امید ہمانا ز جہاں برخیزد

اسی میں کا ایک شعر ہے ؎

جزوے از عالمم و از ہمہ عالم بیشم　　ہمچو موئے کہ بتاں راز میاں برخیزد

اس پر حاضرین میں سے کسی نے اعتراض کیا کہ مصرع اولیٰ میں بیش کی جگہ تفضیلِ

---

[۱] کلیاتِ نثر صفحہ ۱۷۰ (بنام مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ)

[۲] یہ مشاعرہ مدرسۂ عالیہ کی موجودہ ولزلی اسٹریٹ والی عمارت میں ہوا تھا۔ اس سے پہلے مدرسہ بیٹھک خانے میں تھا۔ ولزلی اسٹریٹ والی عمارت کا سنگِ بنیاد ۱۵ر جولائی ۱۸۲۴ء کو رکھا گیا تھا۔ پوری عمارت تین سال کی مدت میں تیار ہوئی اور غالب کے کلکتہ پہنچنے سے صرف چند ماہ پہلے اگست ۱۸۲۷ء میں جماعتیں اس نئی جگہ میں منتقل ہوئی تھیں۔ مشاعرہ میں نشست کا انتظام یوں تھا کہ شعرائے کرام اندر کے مغربی برآمدے میں تشریف فرما تھے۔ حاضرین کی بڑی تعداد باہر کھلے صحن میں فرش پر بیٹھی تھی۔

غالب کے اندازے کے مطابق تقریباً پانچ ہزار کا مجمع تھا۔ (عودِ ہندی صفحہ ۱۴۳ بنام صاحب عالم مارہروی)

بعض بیشتر ہونا چاہیے تھا برابر سے ایک دوسرے صاحب بول اُٹھے کہ مصرع ثانی میں "موے زمیاں" کی ترکیب غلط ہے بلکہ پورا شعر بے معنی ہے۔ ایک اور صاحب نے "ہمہ عالم" کی ترکیب پر فرمایا کہ "عالم مفرد ہے، اس کا ربط ہمہ کے ساتھ بہ حسبِ اجتہاد قتیل ممنوع ہے"!۔[1]

غالب نے ایک اور غزل بھی پڑھی تھی۔ اس میں یہ شعر ہے ؎

شورِ اشکے بہ فشارِ بُنِ مژگاں دارم
طعنہ بر بے سر و سامانیٔ طوفاں زدہٗ

اس پر یہ اعتراض ہوا کہ اس کے دوسرے مصرع میں زدہ کا استعمال غلط ہوا ہے۔

میرزا غالب بھلا قتیل اور دوسرے ہندوستانی فارسی دانوں کو کب خاطر میں لاتے تھے۔ انھوں نے قتیل کا نام سن کر ناک بھوں چڑھائی اور کہا، قتیل کون ؟ وہی فرید آباد کا کھتری بچہ ؟ میں کیوں اس فرومایہ کو سند ماننے لگا۔ اس پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔ غالب کی طرف سے اعتراضوں کے جواب نواب علی اکبر خاں طباطبائی اور مولوی محمد محسن[2] اور مرزا کامران درانی والیٔ ہرات کے سفیر کفایت خاں[3] اور مولوی عبدالکریم[4]

---

[1] عود ہندی صفحہ ۱۷۱ (شاگرد)، درفش کاویانی صفحہ ۱۳۷

[2] کلیات نثر صفحہ ۱۷۰ (بنام مولوی محمد علی خاں)

[3] ایضاً عود ہندی صفحہ ۱۷۱ (بنام عبدالرزاق شاکر) (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

نے دیئے۔ مگر مخالفت کسی طرح فرو نہ ہوئی۔ بلکہ ان کے ایک خط[۱] سے جو انھوں نے قیام کلکتہ کے دوران میں وہیں کے ایک دوست کے نام لکھا ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف شورش مشاعرہ گاہ کی چار دیواری ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ ان کے دوسرے کلام کو بھی شامل کر کے اس پر اعتراض لکھ لیے گئے تھے اور ممکن ہے انھیں شائع بھی کر دیا گیا ہو۔ نیز یہ معاملہ کوچہ و بازار تک پہنچ گیا تھا اور رستہ چلتے لوگ ان پر آوازے کسنے لگے تھے[۲]۔ یہ حالت یقیناً افسوس ناک تھی اور ان کے مقاصد کے سراسر خلاف۔ چوں کہ کلکتہ کے لوگ زیادہ تر قتیلؔ کے شاگرد اور مداح تھے۔ اس لیے غالبؔ نے یہی سوچا کہ دریا میں رہ کر مگر سے بیر، عقلمندی کا طریقہ نہیں۔ نہیں معلوم ابھی مجھے کتنے دن اور یہاں ٹھہرنا ہے اور ان لوگوں سے کیا کیا کام لینا ہیں۔

(پچھلے صفحے سے آگے) ریاست پٹیالہ کے دفتر خانے میں ایک خط موجود ہے، جو محمد شاہ والیٔ ہرات نے مہاراجہ کرم سنگھ کے نام لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے مہاراجہ سے درخواست کی ہے، کہ کفایت خاں ہمارا سفیر، کلکتہ سے دہلی اور پٹیالے کے راستے واپس آ رہا ہے اس کی ہر طرح امداد کی جائے۔

غالباً یہ محمد شاہ، مرزا کامران درانی کا جانشین ہوگا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے، کہ کفایت خاں بہت دن کلکتہ میں مقیم رہا۔

[۳] اردوئے معلی صفحہ ۱۴۲ (بنام میاں داد خاں سیاح)

[۱] مآثر غالب صفحہ ۲۳-۲۴ (بنام مرزا احمد بیگ خاں تپاں)

[۲] مآثر غالب صفحہ ۲۷ (بنام مرزا احمد بیگ خاں تپاں)

اس کے علاوہ وہ جس کام سے وہاں گئے تھے، ان ادبی بحثوں میں اُلجھ کر پوری توجہ اور سکون سے اس کی چارہ جوئی بھی ناممکن تھی۔ ان مصلحتوں کو مدّ نظر رکھ کر انھوں نے نواب علی اکبر خاں اور مولوی محمد محسن کی فرمائش پر اپنی مشہور مثنوی "بادِ مخالف" لکھی[1] جس میں اپنے سفرِ کلکتہ کی غرض و غایت اور فارسی میں اپنے مسلک اور اصول کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا کہ خدا گواہ، میں "آویزشِ بیان" سے نہیں ڈرتا اور نہ مجھے اعتراضوں کا خوف ہے۔ صرف یہ خیال گذرتا ہے کہ اتفاق سے چند روز کے لئے یہاں آیا ہوں۔ اگر آپ لوگوں کو ناراض کرلوں گا تو آپ ہی بعد میں کہیں گے کہ دہلی سے ایک "شوخ چشم" اور "بے حیا" شخص آیا تھا جس نے بزرگوں سے بے کار کا جھگڑا کیا۔ خدا نہ کرے کہ میں اپنے وطن کی بدنامی کا باعث ہوں۔ پس معذرت خواہ ہوں اور درخواست کرتا ہوں کہ آپ یہ واقعہ بھول جائیں۔ مثنوی کے آخر میں قتیل کی بھی تعریف بلکہ ہجو ملیح سی کردی۔ جس میں تعریضات کے نشتر اتنے تیز ہیں کہ اس سے سکون ہونا تو درکنار، ناممکن تھا کہ مخالفت اور نہ بڑھ جاتی۔

مقدمے کا بیان میرزا کا مطالبہ پانچ امور پر مشتمل تھا۔

اول ۴؍ مئی ۱۸۰۶ء کے حکم کے مطابق مجھے اور میرے خاندان

---

[1] یہ مثنوی انھوں نے کلکتہ کے قیام کے دوران میں علیحدہ بھی چھپوائی تھی۔ اب کلیات میں شامل ہے۔ (مثنوی ع۵) لیکن کلیات میں جس طرح چھپی ہے، اسے نقشِ ثانی سمجھنا چاہیے۔ اس کی ابتدائی شکل متفرقاتِ غالب (صفحہ ۱۱۵-۱۴۰) میں موجود ہے۔

کے دوسرے افراد کو دس ہزار روپیہ سالانہ ملنا چاہیے تھا۔ نواب لوہارو پانچ ہزار دیتے ہیں اور اس میں سے بھی دو ہزار ایک غیر شخص خواجہ حاجی (یا اس کے ورثا) کو ملتے ہیں۔ جس کا ہمارے خاندان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آئندہ پورے دس ہزار کی باقاعدہ ادائی کا حکم صادر ہو۔

دوم۔ مئی ۱۸۰۶ء سے لے کر اب تک ہمیں دس ہزار سالانہ سے جتنا کم ملا ہے وہ سارا بقایا دلایا جائے (ان کے حساب سے یہ رقم ڈیڑھ لاکھ کے لگ بھگ بنتی تھی)۔

سوم۔ ہماری پنشن میں کوئی غیر شخص حصّہ دار نہیں ہونا چاہیے (اس سے مدعا یہ تھا کہ خواجہ حاجی کی وفات کے بعد جو رقم ان کے بیٹوں کو مل رہی ہے یہ بند کردی جائے)

چہارم۔ آئندہ میری پنشن رئیس میوات نواب شمس الدین احمد خاں کی جگہ انگریزی خزانے کے ذمے لگادی جائے، تاکہ مجھے اس کی دست نگری نہ کرنا پڑے۔

پنجم۔ ان امور کے خاطر خواہ فیصلے کے علاوہ بطور اعزاز و اکرام مجھے خطاب و خلعت و دربار کا منصب دیا جائے[۵]۔

چوں کہ مقدمہ شروع ہونے سے پہلے ہی اکتوبر ۱۸۲۷ء میں نواب

---

[۵] کلیات غالب قصیدہ ۳۵ سی و پنجم در ستائش سر چارلس تھیافلس مٹکاف سکرٹری حکومت ہند۔ اس قصیدے کے آخر میں بھی یہ مطالب اختصار سے بیان ہوئے ہیں۔

احمد بخش خاں کا انتقال ہو گیا تھا اس لیے' اب مقدمہ میرزا اور نواب شمس الدین احمد خاں کے درمیان تھا۔ نواب شمس الدین احمد خاں نے جواب دعویٰ میں ۷ رجون ۱۸۰۶ء والا فارسی شقہ پیش کیا جس کی رو سے پانچ ہزار کی تقسیم ہوئی تھی۔ میرزا کو اس دستاویز کا علم بھی نہیں تھا۔ اُنھوں نے اسے درست تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اور کہا کہ یہ شقہ جعلی ہے یا کم از کم دھوکے اور فریب سے حاصل کیا گیا ہے۔ اور اس کے لیے' دو دلیلیں دیں۔ پہلی یہ کہ اس کی نقل دہلی سے لے کر کلکتہ تک کسی سرکاری دفتر میں موجود نہیں اور دوسری یہ کہ اس کی پشت پر انگریزی میں دستخط نہیں، جیسا کہ سرکاری دفتر کا ایسے تمام خطوط سے متعلق دستور ہے،' جو فارسی زبان میں لکھے جاتے ہیں[۱]۔ لہٰذا یہ شقہ قابل اعتماد نہیں اور عملدرآمد اسی ۴ رمئی ۱۸۰۶ء والے حکم پر ہونا چاہیے،' جو اس سے پہلے باضابطہ لارڈ لیک کے دستخطوں سے جاری ہوا تھا۔ چوں کہ جس زمانے میں نواب احمد بخش خاں نے یہ دوسرا شقہ لارڈ لیک سے حاصل کیا تھا، ان دنوں سرجان ملکم ان کے سکریٹری تھے۔ اس لیے' ۲۲ اکتوبر ۱۸۳۰ء کو تمام کوائف مقدمہ کے ساتھ یہ شقہ حکومت بمبئی کے چیف سکریٹری کے پاس بھیجا گیا کہ وہ سرجان ملکم سے (جو اب گورنر بمبئی تھے) دریافت کر کے لکھیں کہ غالب کا عذر کس حد تک قابلِ قبول ہے۔ سرجان ملکم نے کہا کہ واقعی یہ شقہ نواب احمد بخش خاں کو دیا گیا تھا۔ پشت پر انگریزی دستخطوں کی عدم موجودگی

---

[۱] متفرقاتِ غالب صہ۱۱ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

کا اعتراض چنداں اہم نہیں۔ اس پر ۲۷ر جنوری ۱۸۳۱ء کو میرزا کو جواب دیا گیا کہ گورنر جنرلِ باجلاس کونسل موجودہ انتظام میں ردو بدل کرنے پر تیار نہیں۔ لیکن وہ اس کے بعد بھی اپنے دعوے سے دست بردار نہیں ہوئے اور اب بھی یہی مطالبہ کرتے رہے کہ ہمیں پہلے حکم کے مطابق دس ہزار سالانہ ملنا چاہیے۔

ولیم فریزر کا قتل

غالب کی پنشن کا قضیہ ابھی درمیان ہی میں تھا کہ خود نواب شمس الدین احمد خاں ایک مصیبت میں گرفتار ہو گئے۔ ان دنوں دہلی میں انگریزی ریذیڈنٹ مسٹر ولیم فریزر تھے۔ ۲۲ مارچ ۱۸۳۵ء کی شام کا کھانا انھوں نے دریا گنج میں راجہ کشن گڑھ کے ہاں کھایا۔ وہاں سے واپسی میں انھیں دیر ہو گئی۔ وہ باڑہ ہندوراؤ میں ایک کوٹھی میں رہتے تھے۔ جب رات گئے گیارہ بجے کے قریب وہ اپنے مکان پر آرہے تھے تو رستے میں کسی نے ان کے مکان سے تھوڑے فاصلے پر، ٹونبیوں کے قریب، انھیں گولی سے ہلاک کر دیا۔ قاتل اُس وقت تو بچ کے نکل گیا لیکن فوراً تمام ناکے بند کر لیے گئے اور تفتیش ہونے لگی۔ آخر کار پولیس نے نواب شمس الدین احمد خاں کے داروغہ اشکار کریم خاں کو گرفتار کر لیا۔ تھوڑے دن بعد نواب کا ایک اور ملازم واصل خاں بھی مشتبہ حالات میں دہلی آتا ہوا گرفتار ہوا۔ جب مزید تحقیقات ہوئی اور کریم خاں کا بیان لیا گیا تو عجیب و غریب انکشافات ہوئے اور بعض قرائن سے شبہہ ہوتا تھا کہ خود نواب کا دامن بھی اس قتل کی ذمہ داری سے پاک نہیں۔ اس دوران میں کریم خاں کا مواتی

ساتھی انیا بھی جو ابھی تک مفرور تھا، سکندر آباد سے پکڑا آیا اور سلطانی گواہ بن گیا۔ اس نے جو بیان دیا اس سے اور کتنی باتیں معلوم ہوئیں۔ اس پر مجسٹریٹ نے نواب صاحب کو لکھا کہ تحقیقات مکمل کرنے کے لیے آپ کی مدد کی ضرورت ہے اس لیے، بہتر ہو اگر آپ فیروز پور سے یہاں تشریف لے آئیں۔ نواب شمس الدین احمد خاں ۸ اپریل ۱۸۳۵ء کو دہلی پہنچے یہاں جب مسٹر سائمن فریزر مجسٹریٹ نے ان سے بعض سوال پوچھے تو نواب کے جوابوں سے اس کی تسلی نہ ہوئی۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ نواب کو باہر کے لوگوں سے الگ رکھا جائے۔ اور تحقیقات کے دوران میں کوئی شخص ان سے ملاقات نہ کرنے پائے۔ نواب صاحب کی خواہش تھی کہ مجھے دریا گنج میں اپنے مکان میں رہنے کی اجازت دی جائے، مگر اخیر فیصلہ یہی ہوا کہ وہ پولیس کے پہرے میں کشمیری دروازے کے باہر انگریز افسروں کے کوارٹروں میں رہیں۔ صرف پانچ ملازم ان کی خدمت اور گھر بلو کام کاج کے لیے رکھنے کی اجازت دی گئی۔ نہ باہر سے کوئی شخص اندر جا سکتا تھا اور نہ اندر سے کوئی باہر آسکتا تھا۔ اس کے علاوہ نواب کے تمام متعلقین خصوصاً ان کے خسر میرزا مغل بیگ خاں پر بھی بہت سختی کی گئی۔ ان کی خانہ تلاشی ہوئی اور کچھ دن انھیں نظر بند بھی رہنا پڑا۔

جائداد لوہارو کا جھگڑا

در اصل نواب شمس الدین احمد خاں اور مسٹر ولیم فریزر کے درمیان کشیدگی پہلے سے تھی۔ کہنے والے تو بیسیوں قصے سناتے ہیں اور اس سلسلے میں بعض گانے بھی مشہور ہیں۔ خدا معلوم

ان میں کتنی سچائی ہے اور کتنا جھوٹ، لیکن اصل وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نواب احمد بخش خاں کی وصیت کے مطابق فیروز پور جھرکہ کا علاقہ، شمس الدین احمد خاں کو ملا تھا اور پرگنہ لوہارو ان کے دونوں چھوٹے بھائیوں، امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں، کے حصے میں آیا تھا۔ نواب احمد بخش خاں کی وفات کے بعد شمس الدین احمد خاں نے اس تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی اور کہا کہ سب سے بڑا بیٹا ہونے کی حیثیت سے تمام جائداد کا قبضہ مجھے ملنا چاہیے دوسری اولاد کو زیادہ سے زیادہ وظیفہ دلایا جا سکتا ہے۔ بالآخر پانچ چھ سال کی متواتر کوششوں کے بعد ستمبر ۱۸۳۲ء میں وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے، اور لوہارو کا نظم و نسق بھی اس شرط پر ان کے سپرد کر دیا گیا کہ وہ اپنے دونوں بھائیوں کے گذارے کے لیے پچیس ہزار روپیہ سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔

اس زمانے میں مسٹر ولیم فریزر ریذیڈنٹ تھے انھوں نے پوری کوشش کی کہ انگریزی حکومت، نواب کے اس مطالبے کو رد کر دے لیکن اس کے باوجود، جب یہ فیصلہ ہو گیا تو انھوں نے دوبارہ صدر میں اس کے خلاف لکھا اور خود نواب امین الدین احمد خاں کو کلکتہ جانے کا مشورہ دیا تاکہ وہاں کوشش کر کے یہ فیصلہ تبدیل کرایا جائے۔ چناں چہ نواب امین الدین احمد خاں ستمبر ۱۸۳۴ء میں کلکتہ گئے، اور وہاں تگ و دو کرتے رہے۔ آخر کار پہلا حکم منسوخ ہو گیا اور لوہارو ان دونوں بھائیوں کو واپس مل گیا۔

نواب شمس الدین احمد خاں انھی مخالفانہ کوششوں کی بنا پر ولیم فریزر سے سخت ناراض تھے اور یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں تھی کہ ان دونوں کی آپس میں

نہیں بنتی۔ اس لئے جب یہ قتل ہوا تو قدرتی طور پر نواب کے خلاف شبہہ زیادہ قوی ہوگیا۔

غالب اور فتح اللہ بیگ خاں

نواب شمس الدین احمد خاں کہتے تھے۔ کہ میرا اس قتل میں کوئی ہاتھ نہیں اور میں بالکل بے قصور ہوں۔ میرے خلاف یہ سب کچھ میرے دشمنوں کی جھوٹی شہادتوں اور مخبریوں کی بنا پر کیا جارہا ہے، جن کا سرغنہ مرزا فتح اللہ بیگ خاں ہے چوں کہ مقتول ریذیڈنٹ غالب کے گہرے دوست اور مربی تھے۔ اور مجسٹریٹ شہر بھی ان کے ملنے والوں میں سے تھے۔ اس لئے لوگوں کو شبہہ ہوا کہ مرزا فتح اللہ بیگ خاں کے علاوہ غالب نے بھی نواب کے خلاف جاسوسی کی ہے[1]۔ لیکن میرا خیال ہے کہ غالب کا دامن اس دھبہ سے پاک ہے۔

فروری ۱۸۳۵ء میں غالب کے خلاف ایک دیوانی مقدمے میں پانچ ہزار روپیہ کی ڈگری ہوگئی[2]۔ ان دنوں دستور یہ تھا کہ اگر مقروض کوئی صاحبِ حیثیت

---

[1] مرزا فتح اللہ بیگ خاں کو غالب نے نواب شمس الدین احمد خاں کا ابن عم لکھا ہے۔ (کلیات نثر صفحہ ۱۶۲) دراصل مرزا فتح اللہ بیگ خاں بیٹے تھے محمد بخش خاں کے اور محمد بخش خاں کے والد تھے قاسم جان۔ جو نواب احمد بخش خاں کے والد عارف جان کے بھائی تھے اس کے علاوہ مرزا فتح اللہ بیگ خاں بیٹے ہوتے تھے نواب شمس الدین احمد خاں کی پھوپھی کے یعنی نواب احمد بخش خاں کی ایک بہن محمد بخش خاں کو بیاہی تھی۔ (دوسری میرزا غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے عقد میں تھی۔)

[2] متفرقات غالب صفحہ ۹۹ - ۱۰۰ (بنام ناسخ)

اور باوجاہت شخص ہوتا تو ڈگری کا روپیہ ادا نہ کرسکنے پر اسے صرف اسی صورت میں گرفتار کیا جاسکتا تھا جب وہ اپنے مکان کی چار دیواری سے باہر ہو۔ بھلا غالب کے پاس روپیہ کہاں کہ وہ ادا کردیتے۔ گرفتاری کی ذلت سے بچنے کے لئے وہ اپنا سارا وقت گھر پر گذارتے اور مغرب کے بعد رات کے اندھیرے میں سوار ہوکر نکلتے اور دوستوں سے ملتے جلتے تھے۔ اسی زمانے میں یہ قتل ہوگیا۔ چوں کہ مجسٹریٹ بھی ان کے دوست تھے، اس لئے وہ جیسے اور دوستوں کے پاس آتے جاتے تھے اسی طرح ان کے ہاں بھی جاتے اور تھوڑی دیر گپ کرنے کے بعد واپس چلے آتے۔ وہاں فریزر کے قتل سے متعلق بھی گفتگو ہوتی اور جیسا کہ خود میرزا نے لکھا ہے[۱] مجسٹریٹ نے انھیں "پژوہشِ کار وحلِ اسرار" میں اپنا ہم راز بنالیا۔

اگر نواب شمس الدین احمد خاں اور فریزر کے کشیدہ تعلقات کسی سے پوشیدہ نہیں تھے تو ان کی غالب دشمنی بھی کسی سے مخفی نہیں تھی۔ اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے غالب سب افسروں سے ملتے رہتے تھے۔ جو مجسٹریٹ اس مقدمے کی تفتیش کر رہا تھا وہ بھی ان کا دوست تھا اور اس کے ہاں میرزا کی آمد ورفت تھی۔ عین مقدمے کے دوران میں بھی یہ راہ ورسم جاری رہی۔ پس عام لوگوں کے لئے غالب کے خلاف چہ میگوئیاں کرنے کے لئے، کافی بلکہ اس سے زیادہ وجہ موجود تھی۔ نواب سے ان کی دشمنی، فریزر سے دوستی، ان کا مجسٹریٹ سے یارانہ اور مقدمے کے دوران میں اس کے ہاں آنا جانا۔ ان ظاہری قرائن سے لوگوں نے شبہہ کیا

---

[۱] کلیات نثر (غالب)، صہ ۱۶۱-۱۶۲ (بنام ناسخ)

کہ غالب نے نواب شمس الدین احمد خاں کی چغلی کھائی ہے اور مخبری کی ہے لیکن یہ شبہہ غلط تھا اور غالب کو ایسا کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

کریم خاں اصل قاتل، مقدمے کے آغاز ہی میں گرفتار ہو چکا تھا۔ نواب کا ایک اور ملازم بھی زیرِ حراست تھا۔ قاتل کا بیان، نواب کی اعانتِ مجرمانہ کا ثبوت تھا اور اسی سے نواب کے خلاف شبہہ پیدا ہوا۔ ان کے فریزر سے کشیدہ تعلقات نے شبہہ کو تقویت دی۔ اس پر مجسٹریٹ نے انھیں دہلی طلب کیا اور بعد میں نظر بند کر دیا۔ مقدمے کی باقاعدہ تفتیش ہوئی۔ اس دوران میں کریم خاں کا ساتھی انیا بھی گرفتار ہو گیا اور اس نے سلطانی گواہ بن کر سارا راز فاش کر دیا۔

ان حالات میں کسی چغلی یا مخبری کی گنجائش ہی کہاں تھی۔ خود نواب شمس الدین احمد خاں کو بھی غالب کے خلاف کوئی شبہہ نہیں تھا اور میرے نزدیک میرزا کو اس الزام سے بری کرنے کے لیے یہی شہادت کافی ہے۔

نواب شمس الدین احمد خاں کو پھانسی

لمبی تحقیقات اور مقدمے کے بعد کریم خاں اصل قاتل قرار پایا اور اسے اس جرم کی پاداش میں ۲۶ اگست ۱۸۳۵ء کو پھانسی دی گئی۔ اس کے ساتھ ہی مجسٹریٹ نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ قتل نواب شمس الدین احمد خاں کی انگیخت پر ہوا ہے اس لیے وہ بھی اسی سزا کے مستحق ہیں۔ چوں کہ نواب ایک ریاست کے حکمران تھے اس لیے مجسٹریٹ کو انھیں سزا دینے کا اختیار حاصل نہیں تھا۔ اس نے مقدمے کے تمام کوائف، اپنا فیصلہ اور سزا کی تجویز کی مکمل رپورٹ گورنر جنرل کو کلکتہ بھیج دی۔ جب نواب کو ان امور کی اطلاع ملی تو انھوں نے اپنے وکیل میرزا اسفندیار بیگ خاں کو کلکتہ بھیجا۔ کہ وہ خود گورنر جنرل کی خدمت میں حاضر ہو کر

عذر داری پیش کرے۔ وکیل نے کلکتہ کے ایک انگریز سالسٹر مسٹر چارلس تھیکرے کی وساطت سے درخواست دی۔ مگر بے کار۔ ۲۱ ستمبر ۱۸۳۵ء کو گورنر جنرل نے باجلاس کونسل یہ فیصلہ کیا کہ نواب شمس الدین احمد خاں کو مسٹر ولیم فریزر کے قتل کی انگیخت کے جرم میں پھانسی کی سزا دی جائے، اوران کی جائداد اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست بحق سرکار ضبط کرلی جائے۔ اس حکم کی تعمیل میں ۸ اکتوبر ۱۸۳۵ء کو جمعرات کے دن صبح کے وقت نواب کو کشمیری دروازہ کے باہر پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ چوں کہ خطرہ تھا کہ کہیں فساد یا بلوہ نہ ہو جائے، اس لئے موقع پر دیسی اور گورہ فوج کا کافی انتظام تھا۔ ایک گھنٹہ تک لاش لٹکتی رہی اور اس کے بعد نواب کے خسر میرزا مغل بیگ خاں کے حوالے کردی گئی۔ انھوں نے اسے لے جاکر قدم شریف میں دفن کردیا۔ شہر میں اس واقعے سے بہت سنسنی پھیل گئی تھی۔ نماز جنازہ میں آٹھ ہزار کا مجمع بیان کیا جاتا ہے۔ امامت مولانا محمد اسحاق نے کرائی۔ وفات کے وقت نواب کی عمر صرف پچیس برس کی تھی۔؎

؎ مطبوعہ کتابوں میں سے اس موضوع پر مفصل ترین بیان وہ ہے جو ٹھگی والے کرنیل سلیمان نے اپنی کتاب (Rambles and Recollections of an Indian Official) کی دوسری جلد کے سولھویں باب میں لکھا ہے۔ مولوی بشیر الدین احمد دہلوی نے "واقعات دارالحکومت دہلی" کے حصہ دوم (صہ ۴۹۲-۴۹۳) میں بھی اس واقعہ کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ اغلاط سے پاک نہیں۔ یہاں میں نے بعض تفصیلات غیر مطبوعہ کاغذات سے (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

مقدمہ کا فیصلہ نواب شمس الدین احمد خاں کی وفات اور فیروز پور جھرکہ کی ریاست کی ضبطی کے بعد میرزا غالب کو پنشن دہلی کلکٹری سے ملنے لگی۔ لیکن ان کا مقدمہ بدستور چل رہا تھا۔ آخر ۱۸ جون ۱۸۳۶ء کو لفٹنٹ

(پچھلے صفحہ سے آگے) بہم پہنچائی ہیں۔

فیروز پور جھرکہ میں ایک روایت مشہور ہے کہ نواب شمس الدین احمد خاں کے زوال اور تباہی کا باعث ایک فقیر مستان شاہ کی بد دعا تھی۔ کہتے ہیں کہ نواب شمس الدین احمد خاں نے قلعے میں اپنے لئے ایک کوٹھی تعمیر کرائی۔ ابھی وہ تکمیل کو نہیں پہنچی تھی کہ چونہ ختم ہو گیا اور باوجود تلاش شہر میں بھی کہیں سے دستیاب نہ ہوا۔ قلعے کے سامنے مستان شاہ کا تکیہ تھا اور وہاں کچھ تیار چونہ پڑا تھا جو اس نے ایک مسجد تعمیر کرنے کے لئے مانگ مانگ کر جمع کیا تھا۔ نواب نے جب سُنا کہ فقیر کے ہاں چونہ ہے تو خود جا کر اسے زبردستی اُٹھوا لایا۔ مستان شاہ کی زبان سے نکل گیا کہ فقیر کا چونہ جس مکان میں لگے گا وہ آباد نہیں ہوگا۔ خدا کی شان یہ بد دعا تیر بہدف ثابت ہوئی۔ اس کے بعد فریزر کا قتل ہوا اور نواب بھی اسی سلسلے میں دہلی بلائے گئے۔ کوٹھی تیار کھڑی تھی۔ نواب نے فیصلہ کیا تھا کہ عید کے دن اس کا افتتاح ہوگا۔ عین نمازِ عید میں دہلی سے حکم پہنچا کہ فوراً یہاں آئیں۔ چنانچہ وہ کوٹھی میں جانے بھی نہیں پائے تھے کہ دہلی کی طرف روانہ ہو گئے۔ یہاں سے واپس جانا نصیب ہی نہ ہوا۔ (مرقع ادب صفحہ ۱۴۳)

جنابِ حمید الدین بیخود دہلوی نے مجھ سے بیان کیا کہ نواب نے جب سُنا کہ مستان شاہ نے بد دعا دی ہے تو اسے ایک درخت سے بندھوا کر پٹوایا بھی تھا۔ چونکہ اپنی خاندانی روایات کے خلاف نواب شمس الدین احمد خاں پیروں، فقیروں کے قائل نہیں تھے (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

ے اگلے صفحہ پر دیکھئے

گورنر غرب وشمال (حال یو۔پی) نے فیصلہ کیا کہ ۷ رجون ۱۸۰۶ء کے شقّے کے مطابق جو ساڑھے سات سو سالانہ انھیں ملتے رہے ہیں وہی درست ہیں اور آئندہ بھی وہ اس سے زیادہ کے حقدار نہیں۔ میرزا نے اس کے خلاف گورنر جنرل کے پاس اپیل کی، مگر وہاں سے بھی یہی فیصلہ بحال رہا۔

سب طرف سے مایوس ہو کر میرزا نے ۲۴ر نومبر ۱۸۳۶ء کو یہ درخواست دی کہ میرا مقدمہ صدر دیوانی عدالت کلکتہ کے سامنے رکھا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کمپنی کے ڈائرکٹروں کے پاس فیصلہ کے لئے ولایت بھیج دیا جائے۔ اس پر ۵ر دسمبر ۱۸۳۶ء کو جواب ملا کہ مقدمہ کے تمام کاغذات ولایت بھیج دیئے جائیں گے۔[۱] یہ اطلاع ملنے پر میرزا نے ۲۶ر دسمبر ۱۸۳۶ء کو درخواست دی کہ مئی ۱۸۰۶ء سے آج تک جتنا ہمیں دس ہزار سالانہ سے کم ملا ہے۔ وہ دو لاکھ تین ہزار روپیہ بنتا ہے۔ یہ اس دو لاکھ ساٹھ ہزار کی رقم سے وضع کرکے دے دیا جائے، جو نواب شمس الدین احمد خاں نے اپنی وفات سے پہلے انگریزی خزانے میں جمع کرائی تھی۔ دوسرے ہمیں تین ہزار سالانہ پنشن کا اپریل ۱۸۳۵ء تک کا بقایا اس جائداد سے دلوایا جائے، جو نواب فیروز پور جھرکہ چھوڑ مرے ہیں اور تیسرے جب تک

دیکھئے صفحے کے گئے) اس لئے عین ممکن ہے کہ ان سے یہ حرکت واقعی سرزد ہوئی ہو۔

؎ مکاتیب غالب ص۵۳ (مکاتیب)

[۱] یہ تمام کاغذات (La Belle Alliance) نامی جہاز کی ڈاک میں ۱۰ر مئی ۱۸۳۷ء کو ولایت بھیجے گئے تھے۔ کلیات نظم فارسی کا قطعہ نمبر ۲۱ اسی موقع پر لکھا گیا تھا۔

ڈائرکٹروں کا فیصلہ موصول نہیں ہوتا۔ ہمیں تین ہزار سالانہ باقاعدہ ملتا رہے۔ مگر یہ تمام درخواستیں بے کار گئیں اور ۱۸۴۲ء کے شروع میں ولایت کا آخری فیصلہ بھی ان کے خلاف ہو گیا اور لکھا آیا کہ جو کچھ ہندستان میں فیصلہ ہو چکا ہے وہی درست ہے۔ میرزا اس کے بعد بھی ہمت نہیں ہارے۔ انھوں نے ۲۹ جولائی ۱۸۴۲ء کو اس فیصلہ کے خلاف بطور اپیل ایک میموریل ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی خدمت میں ارسال کرنے کے لئے گورنر جنرل کو بھیجا۔ مگر اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ اور آخر وہ ۱۸۴۴ء میں بالکل مایوس ہو کر بیٹھ گئے۔[1]

خلعت اور دربار

یہ مقدمہ ۱۸۲۸ء سے لے کر ۱۸۴۴ء تک تقریباً سولہ سال تک جاری رہا۔ آج جب آمد و رفت اور رسل و رسائل کی اتنی آسانیاں مہیا ہیں ہم ان مشکلات کا اندازہ نہیں لگا سکتے، جو میرزا کو اس زمانے میں پیش آئی ہوں گی۔ بلا مبالغہ اس مقدمہ پر ان کا ہزاروں روپیہ اُٹھ گیا، جس کا بڑا حصہ اُنھوں نے مہاجنوں سے سود پر قرض لیا تھا، چوں کہ انھیں آخری فیصلے کے اپنے حق میں ہو جانے اور اس کے نتیجے میں ایک بھاری رقم کے ملنے کا پورا یقین تھا اس لئے انھوں نے نہ کبھی بڑی سے بڑی رقم قرض لینے سے دریغ کیا اور نہ سود کی شرح ہی کی پروا کی۔ بدقسمتی سے مقدمے کا فیصلہ ان کے خلاف ہو گیا اور ان کی باقی عمر اس قرض کے چُکانے میں کٹ گئی۔ ان کی پریشانیوں کا کچھ اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ۱۸۳۵ء میں جب ان کے

---

[1] یہاں مقدمے کے حالات میں کتنی تفصیلات ایسی ہیں، جو غیر مطبوعہ کاغذات پر مبنی ہیں۔

خلاف پانچ ہزار روپے کی ڈگری ہوئی ہے، تو اس زمانے میں انھیں مجموعی طور پر چالیس پچاس ہزار روپیہ قرض دینا تھا۔[1]

انھوں نے مقدمے کے آغاز میں پانچ مطالبے کیے تھے۔[2] پہلے تین کا فیصلہ تو قطعی طور پر ان کے خلاف ہوا۔ نواب شمس الدین احمد خاں کے پھانسی پا جانے پر چوتھا خود بخود پورا ہو گیا کیوں کہ فیروز پور کی ریاست ضبط ہو گئی اور اس سے متعلق جتنی پنشنیں اور وظیفے تھے، وہ اس کے بعد انگریزی خزانے سے ملنے لگے۔ رہا پانچواں، تو انھیں تمام سرکاری درباروں میں کرسی نشینی اور ہفت پارچہ خلعت اور تین رقم جواہر کا اعزاز حاصل ہو گیا۔ دربار کا حق انھیں لارڈ ولیم بنٹنک کے عہد میں اس وقت ملا، جب وہ مقدمے کے لیے کلکتہ گئے ہیں اور خلعت کا لارڈ ڈالن برا کے عہد میں (۱۸۴۲ء-۱۸۴۴ء) جب یہ مقدمہ ختم ہونے کے قریب تھا۔ انھوں نے ۱۸۴۲ء میں کمپنی کے ڈائرکٹروں کے آخری فیصلے کے خلاف بطور اپیل ایک درخواست ملکۂ معظمہ کی خدمت میں بھیجی تھی۔ فیصلے پر تو اس کا کوئی اثر نہیں ہوا البتہ اشک شوئی کے طور پر انھیں سرکاری درباروں میں سیدھے ہاتھ کے دسویں نمبر پر کرسی نشینی کے علاوہ خلعت کا مزید اعزاز عطا کیا گیا۔ اور دیکھا جائے تو نمبر کے لحاظ سے یہ بہت بڑا اعزاز تھا۔

منشی حبیب اللہ خاں ذکا لکھتے ہیں:[3]

---

[1] متفرقاتِ غالب صفحہ ۱۰۱ (بنام ناسخ)

[2] دیکھو اوپر صفحہ ۶۶-۶۷

[3] اردوئے معلّی صفحہ ۲۷

> میں ۱۸۳۰ء میں کلکتے گیا۔ نواب گورنر سے ملنے کی درخواست کی۔ دفتر دیکھا گیا۔ میری ریاست کا حال معلوم کیا گیا۔ ملازمت ہوئی۔ سات پارچے اور جیغہ، سرپیچ، مالائے مروارید۔ یہ تین رقم خلعت ملا۔ زاں بعد جب دہلی میں دربار ہوا، مجھ کو بھی خلعت ملتا رہا۔

قطع نظر اس سے کہ سفر کلکتہ کی تاریخ میں سہو ہوا ہے اور یہاں ۱۸۳۰ء کی جگہ ۱۸۲۷ء چاہیے، اس خط سے یہ غلط فہمی پیدا ہو سکتی ہے کہ دربار اور خلعت کے دونوں اعزاز اس سفر میں عطا ہوئے۔ صحیح وہی ہے جو میں نے لکھا ہے۔ یہاں انھوں نے محض اختصار کی خاطر ایسا لکھ دیا ہے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ قیام کلکتہ کے زمانے میں وہ کسی ایسے دربار میں شامل ہوئے ہوں جس میں انھیں خاص طور پر خلعت بھی ملا ہو۔ ورنہ اس سفر میں انھیں مستقل اعزاز صرف دربار کا ملا تھا۔[1]

دہلی کالج کی مدرسی

۱۸۴۲ء میں میرزا کو دہلی کالج میں فارسی کی میر مدرسی کا عہدہ پیش کیا گیا لیکن انھوں نے اپنی تنک مزاجی کے باعث اسے منظور کرنے سے انکار کر دیا۔

دہلی کالج میں مولوی مملوک علی نانوتوی عربی کے میر مدرس تھے جو بقول منشی کریم الدین "عالمِ بے بدل اور متقیِ بے مثل اور فاضل کامل" تھے[2]۔ کالج میں فارسی

---

[1] غیر مطبوعہ کاغذات پر مبنی۔

[2] طبقات الشعرائے اردو از منشی کریم الدین

کی تعلیم کا کوئی خاطر خواہ انتظام نہیں تھا۔ جب ۱۸۴۲ء میں صوبہ غرب و شمال کے لفٹنٹ گورنر مسٹر ٹامسن کالج کے معائنے کے لئے تشریف لائے، تو انھوں نے فرمایا کہ جس طرح عربی کی تعلیم کے لئے ایک قابل مولوی صاحب موجود ہیں، اسی طرح فارسی کے لئے بھی ایک فاضل مدرس کا انتظام کیا جائے۔ صدر الصدور مفتی صدر الدین خاں آزردہ بھی معائنے کے وقت ساتھ تھے۔ انھوں نے کہا کہ دہلی میں تین صاحب فارسی کے اُستاد مانے جاتے ہیں۔ میرزا اسد اللہ خاں غالب حکیم مومن خاں مومن اور شیخ امام بخش صہبائی۔ اس پر ٹامسن صاحب نے پہلے میرزا کو بلوا بھیجا۔ اگلے دن یہ سوار ہو کر بنگلے پر پہنچے اور دروازے پر کھڑے، لگے انتظار کرنے کہ ابھی کوئی صاحب استقبال کو آتے ہیں۔ جب کسی نے آ کے ان سے کہا کہ حضرت تشریف لایئے، تو کہا کہ صاحب کوئی آگے سے لینے کو آئے تو اُتروں۔ یہ گفتگو سن کر مسٹر ٹامسن خود باہر نکل آئے اور کہنے لگے کہ چوں کہ آپ رسمی ملاقات کے لئے نہیں، بلکہ ملازمت کے لئے آئے ہیں، اس لئے کوئی پذیرائی کو کیسے حاضر ہوتا تو میرزا بولے کہ ملازمت اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ اس سے میرے عز و وقار میں اضافہ ہو، نہ کہ جو پہلے سے ہے، اس میں بھی کمی آ جائے۔ اگر ملازمت کے معنی موجودہ مرتبے میں بھی کمی کے ہیں تو ایسی ملازمت کو میرا دور ہی سے سلام ہے اور کہاروں کو حکم دیا کہ واپس لوٹ چلو۔[1]

اس پر ٹامسن صاحب نے حکیم مومن خاں کو بلوایا۔ یہ پہنچے جب تنخواہ کی بات

---

[1] آبِ حیات (آزاد) صفحہ ۵۰۷۔۵۰۸

چلی تو انھوں نے کہا کہ مولوی مملوک علی صدر مدرس عربی سو روپیہ مہینا پاتے ہیں۔ میں اس سے کم قبول نہیں کروں گا۔ چوں کہ وہ چالیس سے زیادہ دینے پر تیار نہیں تھے اس لیے یہ انکار کر کے چلے آئے۔ صہبائی کا کوئی ذریعہ معاش نہیں تھا انھوں نے چالیس قبول کر لیے۔ بعد میں یہ پچاس کر دیے گئے۔[۱]

حادثۂ اسیری

میرزا کو شروع سے شطرنج اور چوسر کھیلنے کی عادت تھی بعض اوقات دوست احباب بھی ان کے مکان پر جمع ہو جاتے اسی طرح ہنسی خوشی، کھیل تماشے میں وقت گزارتے۔ وہ عام طور پر تفریحاً کچھ بازی بد کر کھیلا کرتے تھے۔ حکام بھی ان حرکتوں سے چشم پوشی کرتے۔ فی الواقع یہ کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی، کیونکہ اس زمانے میں خوش باش امیروں اور بے فکر رئیسوں کا یہ عام مشغلہ تھا۔ لیکن جونہی کوئی زیادہ سنجیدہ مزاج حاکم آجاتا، یہی ہنسی کھیل کا سامان، بلائے جان بن جاتا اور ان غریبوں کی شامت آجاتی۔ دہلی اردو اخبار کی ۲۲ اگست ۱۸۴۱ء کی اشاعت سے معلوم ہوتا ہے،[۲] کہ اسی طبیعت کے ایک تھانیدار صاحب ان دنوں اس علاقے میں تعینات ہو گئے۔ انھوں نے ایک دن میرزا کے مکان پر چھاپہ مارا اور انھیں، بعض دوستوں سمیت، کھیلتے میں گرفتار کر لیا اور عدالت نے سب کو جرمانہ کر دیا چنانچہ میرزا کو بھی سو روپیہ جرمانہ کی سزا ہوئی اور مزید یہ حکم ہوا کہ اگر جرمانہ ادا نہ کریں، تو

۱۔ مرحوم دہلی کالج (عبدالحق)، صفحہ ۱۵۲-۱۵۳

۲۔ بحوالہ تاریخ صحافت اردو (امداد صابری) صفحہ ۱۴۰

چار مہینے قید میں رہیں۔ بظاہر انھوں نے جرمانہ ادا کر کے گلو خلاصی کرائی۔

اگر خدا انھیں توفیق دیتا، تو یہی سزا لے، جرمانہ ان کے لئے عبرت کا سامان بن جاتی اور وہ آئندہ کے لئے، اس بری علت سے توبہ کر لیتے۔ لیکن بچپن کی عادتیں بھلا کہیں اس آسانی سے ترک ہوئی ہیں۔ اس تلخ تجربے کے باوجود وہ متنبہ نہ ہوئے، اور بدستور اپنی دلچسپیوں میں مگن رہے۔

آخر یہ آزادہ روی رنگ لائی، اور اواخر مئی ۱۸۴۷ء میں وہ پھر ایک مرتبہ جوئے کے الزام میں گرفتار ہو گئے۔ اور اب کے نتیجہ زیادہ افسوسناک نکلا۔

مولانا حالی نے میرزا کے ایک خط کی بنا پر لکھا ہے؎ کہ کوتوالِ شہر ان کا دشمن تھا اس لئے، اس نے انھیں قمار بازی کے جُرم میں گرفتار کر لیا۔

مولانا ابو الکلام آزاد فرماتے ہیں کہ چوں کہ میرزا، حالی کے استاد اور ممدوح تھے اس لئے، انھوں نے تفصیل نہیں لکھی، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ ان دنوں میرزا کا مکان باقاعدہ قمار خانہ بن گیا تھا۔ چاندنی چوک کے بعض جوہریوں کو جوئے، کا چسکا پڑ گیا۔ ادھر میرزا کو بھی شروع سے چوسر کھیلنے کی لت تھی۔ یہ سب لوگ ان کے مکان پر جمع ہوتے اور جوا کھیلتے تھے۔ جب تک محمد میرزا خاں عرف میرزا خانی کوتوالِ شہر تھے، ان لوگوں کو کسی قسم کا ڈر نہیں تھا کیونکہ وہ غالب کے گہرے دوست اور مداح تھے۔ ان کے جانے کے بعد فیض الحسن خاں نئے، کوتوال آئے، یہ نہ صرف ان سے واقف ہی نہیں تھے بلکہ طبعاً کچھ سخت گیر بھی واقع ہوئے تھے اور خدا معلوم کیوں

؎ یادگارِ غالب (حالی)، صہ ۲۷، دلی کا آخری سانس (حسن نظامی)، صہ ۱۷۱

انھیں مرزا سے عداوت پیدا ہو گئی۔ ادھر حکام بھی اس کوشش میں لگے تھے کہ کسی طرح شہر سے جوئے کی وبا کم ہو۔ پس ایک دن فیض الحسن کوتوال رتھ میں برقنداروں کو لے کے میرزا کے مکان پر پہنچ گیا۔ اطلاع کرائی کہ کچھ زنانی سواریاں آئی ہیں۔ جس پر کسی نے ان کے داخلے پر اعتراض نہ کیا۔ لیکن جب اندر جانے پر بھید کھلا، تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مزاحمت ہوئی، جس پر پولیس کو سختی کرنا پڑی اور زدوکوب تک نوبت پہنچی۔ بہر حال میرزا جوا خانہ قائم کرنے کے جرم میں گرفتار کر لئے گئے۔[1] مقدمہ کنور وزیر علی خاں مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش ہوا۔[2] دربارِ شاہی اور شہر کے رؤسا کی طرف سے سفارشیں گئیں اور بہت کوشش ہوئی کہ کسی طرح میرزا سزا سے بچ جائیں لیکن بے سود۔ ان کوششوں اور اپیلوں کا کوئی فائدہ نہ ہوا اور آخر کار صدر عدالت نے بھی عدالت ماتحت کا فیصلہ بحال رکھتے ہوئے چھ ماہ قید بامشقت اور دو سو روپیہ جرمانہ کی سزا کا حکم دے دیا اور فیصلہ میں لکھا کہ جرمانہ ادا نہ کرنے کی صورت میں، چھ ماہ مزید قید اور اگر اصل جرمانہ کے علاوہ پچاس روپیہ ادا کر دیں، تو مشقت معاف ہو جائے گی۔[3] لیکن وہ پورے چھ ماہ قید خانہ میں نہیں رہے۔ تین ماہ کے بعد ڈاکٹر راس سول سرجن دہلی کی سفارش پر رہا کر دیے گئے۔[4]

---

[1] کلام عاصی (منشی گھنشیام لال عاصی دہلوی)، صفحہ ۲۶۳-۲۶۴

[2] لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق)، صفحہ ۳۳

[3] دہلی کا آخری سانس صفحہ ۱۷۴

[4] کلامِ عاصی صفحہ ۲۶۴

اگرچہ یہ قید محض نظر بندی تھی۔ کھانا کپڑا سب کچھ گھر سے جاتا تھا۔ دوست احباب کی ملاقات پر بھی کوئی خاص پابندی نہیں تھی، مگر پھر بھی قید تھی۔ اس لئے میرزا جیسے خوددار شخص نے اسے بہت محسوس کیا۔ لکھتے ہیں:[1]

"میں ہر اک کام خدا کی طرف سے سمجھتا ہوں اور خدا سے لڑا نہیں جا سکتا۔ جو کچھ گذرا اس کے ننگ سے آزاد اور جو کچھ گذرنے والا ہے، اس پر راضی ہوں۔ مگر آرزو کرنا آئین عبودیت کے خلاف نہیں ہے۔ میری یہ آرزو ہے کہ اب دنیا میں نہ رہوں اور اگر رہوں تو ہندوستان میں نہ رہوں۔ روم ہے، مصر ہے، ایران ہے، بغداد ہے۔ یہ بھی جانے دو۔ خود کعبہ، آزادوں کی جائے پناہ، آستانۂ رحمۃ للعالمین، دل دادوں کی تکیہ گاہ ہے۔ دیکھئے، وہ وقت کب آئے گا کہ درماندگی کی قید سے، جو اس گذری ہوئی قید سے زیادہ جان فرسا ہے، نجات پاؤں اور بغیر اس کے کوئی منزلِ مقصود قرار دوں، سر بصحرا نکل جاؤں۔ یہ ہے، جو کچھ کہ مجھ پر گزرا اور یہ ہے، جس کا میں آرزو مند ہوں۔"

اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس قید سے ان کے عز و وقار کو سخت نقصان پہنچا، لیکن یہ علم و ادب کے لئے عظیم الشان فائدے کا باعث ہوئی۔ قید خانے میں جو ترکیب بند[2] انھوں نے لکھا ہے اور جسے ہم موضوع کی مناسبت سے اسیر یہ کہہ سکتے

---

[1] یادگارِ غالب صفحہ ۲۷-۲۸

[2] یہ ترکیب بند سبد چین میں شامل ہے (صفحہ ۲۴-۳۰)

ہیں وہ فارسی نظم کے سرمایے میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اسلوبِ بیان اور سوز و گداز اور شدتِ جذبات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ خاقانی کے حبسیہ سے کسی طرح کم نہیں، بلکہ بعض مقامات پر تو یقیناً اس سے بڑھ گیا ہے۔ زمانۂ اسیری میں ان کے دوستوں نے ان سے بہت ہمدردی اور خلوص کا اظہار کیا۔ خصوصاً نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ نے ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ میرزا نے اس نظم میں اس کا پُرزور اعتراف کیا ہے۔

مالی مشکلیں

غالب کے لیے یہ بڑی سختی کے دن تھے بلکہ واقع یہ ہے کہ وہ پچھلے بیس پچیس برس سے نہایت پریشانی کے عالم میں بسر کر رہے تھے۔ کلکتے سے واپس آنے کے بعد ۱۸۳۳ء میں تو ان کی حالت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ مجبور ہو کر وہ اس پر بھی تیار ہو گئے تھے کہ ہندوستان کے کسی والیٔ ریاست کی ملازمت اختیار کر لیں۔ لیکن اس بے بسی کے عالم میں بھی فطری خودداری اور اپنے کمال کا احساس انھیں اس بات کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ وہ آپ کسی کے آگے ہاتھ پھیلائیں بلکہ چاہتے تھے کہ کوئی قدردان اور پایہ شناس رئیس ان کے شایانِ شان اعزاز و اکرام سے انھیں خود اپنے پاس بلائے، چناں چہ لکھتے ہیں:[۵]

"عالیا بر آں سرم کہ اگر کسے از جاہ مندانِ ہندوستان بمن پردازد و بہ ہنجارِ اندازۂ نگاہ داری، و قانونِ پایہ شناسی، مرا بہ سوئے خود خواند، دل بہ پیچاکِ طرۂ دل آویز گردہش بندمے، و رختِ سفر بہ سایۂ دیوار قصرِ والائش کشائمے۔"

---

۵ مآثرِ غالب صفحہ ۲۰ (بنام خواجہ فخر اللہ)

اور غالباً یہی وجہ ہوئی کہ نہ وہ کسی جگہ جا سکے، نہ ان کی مالی پریشانیوں کا خاتمہ ہوا۔ وہ خود سلسلہ جنبانی کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ادھر ہمارے رئیسوں کو دُنیا جہان کی دوسری لغویتوں سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ ایک شاعر اور ادیب کی بے طلب قدر افزائی کریں۔

لطیفہ ۱۸۳۵ء میں جب ان پر پانچ ہزار روپے کی ڈگری ہوئی ہے تو اس زمانے میں ان کے ذمے چالیس پچاس ہزار کا قرض تھا۔[1] ناسخ نے انھیں لکھا کہ آج دکن میں ہُن برس رہا ہے۔ حیدر آباد میں مہاراجہ چندو لال اہلِ کمال کا قدر دان موجود ہے۔ اگر آپ وہاں چلے جائیں تو آپ کے سب دلدر دور ہو جائیں۔ میرزا نے جواب دیا کہ پہلے تو قرضہ ادا کیے، بغیر یہاں سے ہلنا محال ہے پھر اگر وہاں جاؤں بھی، تو چندو لال غریب میری کیا قدر کرے گا۔ اسے میرے طرزِ سخن کی ہوا تک نہیں لگی اور اس کے کان اس آوازے سے آشنا نہیں۔ جہاں فارسی میں قتیلؔ اور اردو میں شاہ نصیرؔ استاد مانے جاتے ہوں وہاں غالبؔ اور ناسخؔ کو کون پوچھتا ہے۔ مزید براں وہ اسّی سال کا بڈھا خود قبر میں پاؤں لٹکائے بیٹھا ہے۔ جب تک میں حیدر آباد پہنچوں، وہ آپ عدم آباد پہنچ چکا ہوگا۔ فرماتے ہیں:[2]

"انصاف بالائے طاعت است۔ عزیمتِ سفر بے گسستنِ بندِ وام امعنا پذیر نیست، و چوں ایں بند گسستہ، و ایں سنگ از راہ برخاستہ شد،

---

[1] متفرقاتِ غالب صفحہ ۱۰۱ (بنام ناسخؔ)

[2] متفرقاتِ غالب صفحہ ۱۰۱-۱۰۲ (بنام ناسخؔ)

حیف باشد، کہ جز راہِ نجف پویم، دوائے بُرمن، اگر جز دوئے جویم۔ چند دلال زمزمۂ مارا چہ داند، و ہنجارِ مارا کہ دریابد۔ آں کہ در پارسی قتیل را بادشاہی گیرد، غالب را چہ می کند، و آں کہ در اردو نصیر را ستاید، ناسخ را چہ می کند۔ وخود عمرش از ہشتاد متجاوز است، تا باُو می رسم، او بہ جہنم می رسد۔"

اسی سلسلے میں ایک اور واقعے کا ذکر بھی غالباً بے محل نہیں ہوگا۔ کلکتہ کے مشہور اخبار "جام جہاں نما" کی ایک اشاعت میں مندرجہ ذیل خبر ملتی ہے۔[۵]

"عرض شد، کہ میرزا اسد اللہ خاں برائے ملاقاتِ یوسف خاں رفتہ بود۔ دراثنائے راہ، چپراسیِ عدالت بابتِ نالش دوصد و پنجاہ (۲۵۰) روپیۂ میکفرسن صاحب اورا گرفتار نمودہ، درمکانِ ناظر بردہ، قید نمودہ۔ امین الدین خاں چہار صد (۴۰۰) روپیہ مع اصل و سود دادہ، اورا رہا کنانید۔"

یہ میکفرسن صاحب، کوئی شراب فروش دُکاندار ہوں گے، جہاں سے میرزا اپنی ضرورت کا سامان منگواتے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی مالی پریشانیوں کا یہ سلسلہ بہت دن تک جاری رہا۔

قلعہ کی ملازمت

لیکن یہ فاقہ مستی کب تک چل سکتی تھی۔ پیٹ بھرنے کو روٹی اور تن ڈھانکنے کو کپڑا درکار ہے۔ یہ کام نری شاعری سے تو نہیں ہو سکتا۔ لے دے کے پنشن کے ساڑھے باسٹھ روپے مہینہ تھے۔ ننھیال سے فتوح کا سلسلہ غالباً بند ہو چکا تھا۔ اور کوئی آمدنی کی صورت نہ تھی۔ وہ شروع سے

۵۔ "جام جہاں نما" نمبر ۸۳ (۷۔ جون ۱۸۳۷ء)

آرام و آسائش بلکہ اسراف کی زندگی بسر کرنے کے عادی تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ عسیر الحالی ان پر بہت شاق گذرتی ہوگی۔ ان کے دوستوں کو بھی فکر ہوئی۔ آخر یہ تجویز ٹھیری کہ کسی طرح میرزا کا تعلق قلعۂ معلیٰ سے ہو جائے۔ میرزا کے کلام سے شہادت ملتی ہے کہ ان کے دربار سے بے ضابطہ اور غیر مستقل رنگ کے تعلقات بہت زمانے سے تھے۔ لیکن یہ تعلق بس اتنا ہی تھا کہ وہ عید، بقرعید یا کسی شادی بیاہ کی تقریب پر قصیدہ یا قطعہ پیش کر دیتے تھے۔ مستقل طور پر وہ کبھی ملازمانِ شاہی میں داخل نہیں ہوئے۔ اور گمانِ غالب یہ ہے کہ انھوں نے خود بھی اس کے لئے کوشش نہیں کی۔ ذوقؔ ۱۸۰۸ء سے اُستادِ ظفر تھے۔ ان کی موجودگی میں کوئی اور اُستادِ شاہ اور ملک الشعرا[1]، تو ہو نہیں سکتا تھا، اور غالبؔ اس سے کم پر تیار نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ دربار ہی کونسا سنجر اور ملک شاہ یا جہانگیر اور شاہ جہاں کا دربار تھا کہ انھیں اس سے کوئی زیادہ توقع ہوتی۔ جس زمانہ میں ظفر ابھی ولی عہد تھے، ذوقؔ کو چار روپیہ مہینا ملتا رہا۔ جب تخت پر بیٹھے تو تیس پانے لگے۔ بعد میں اور اضافہ ہوا تو سو ہو گئے[2]۔ مگر بُرا ہوا احتیاج کا، جب سب طرف سے مایوس ہو گئے، تو آخر انھوں نے بادشاہ کی "وظیفہ خواری" اور "دعا گوئی" پر آمادگی کا اظہار

---

[1] ایک بات یاد رکھنے کی ہے کہ ذوقؔ کا اصل خطاب "سلطان الشعرا" تھا نہ کہ "ملک الشعرا" غالبؔ نے بھی پنج آہنگ میں جہاں کہیں ان کا ذکر کیا ہے "سلطان الشعرا"، ہی لکھا ہے اگرچہ وہاں یہ طنز سے لکھا ہے۔

[2] آبِ حیات صفحہ ۴۵۸،۴۴۲

کیا۔ مولانا فخر الدین رحمتہ اللہ علیہ کے پوتے مولانا نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب، بہادر شاہ ظفر کے پیر تھے اور غالب کے بھی خاص دوست اور مہربان۔ ان کے علاوہ طبیبِ شاہی احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں مدار المہام بھی میرزا کے قدر دان تھے۔ ان صاحبوں نے سفارش کی اور بہادر شاہ نے منظور کر لیا کہ میرزا خاندانِ تیموری کی تاریخ فارسی زبان میں لکھیں۔ میرزا جمعرات کے دن ۴ جولائی ۱۸۵۰ء (۲۳ شعبان ۱۲۶۶ھ) کو بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے[1]۔ ظفر نے "نجم الدولہ، دبیر الملک، نظام جنگ" کہہ کر خطاب کیا۔ کارپردازوں نے بادشاہ کے حکم سے چھ پارچے اور تین رقم جواہر کا خلعت پہنایا، پچاس روپیہ ماہانہ مشاہرہ مقرر ہوا اور یوں میرزا باقاعدہ قلعے کے ملازم ہو گئے۔

قلعے کا یہ دستور تھا کہ ملازموں کی تنخواہ سال میں دو بار بٹتی تھی۔ ہر شش ماہی کے خاتمے پر ان چھ مہینوں کا چٹھا بانٹ دیا جاتا۔ غالب کی ضرورتوں کے سامنے اوّل تو ان پچاس روپوں کی ہستی ہی کیا تھی، اس پر وہ بھی ملیں چھ چھ مہینے میں۔ پہلی چھ ماہی تو انھوں نے جوں توں کاٹی، لیکن جنوری ۱۸۵۱ء میں یہ درخواست پیش کی کہ آپ کی ذرہ نوازی کہ مجھ بے ہنر کو اپنی ملازمت کا شرف بخشا اور روزینہ مقرر فرمایا۔ لیکن اس کے ملنے کا عجیب طریقہ ہے۔ چھ چھ مہینے بعد ملتا ہے۔ مجھے ذوقِ آرائش نہیں کہ طرّہ و دستار چاہوں، مگر ان روزمرہ کی ضرورتوں کا کیا

---

[1] کلیات نثر فارسی صفحہ ۱۷۲۔ یہاں میرزا غلطی سے ۴ جولائی کی جگہ ۴ جون لکھ گئے ہیں۔ ۲۳ شعبان کو ۴ جولائی تھی اور ۴ جون کو ۲۲ رجب۔

کروں۔ انھیں اتنی مدت کے لئے ملتوی نہیں کر سکتا۔ مجبور ہو کر قرض لیتا ہوں۔ لیکن آئے دن قرض لینے سے مہاجن سود کی شرح زیادہ مقرر کرتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی چھ ماہی میں سے ایک تہائی سود میں چلی گئی۔ پیر و مرشد،

آپ کا بندہ اور پھروں ننگا　　آپ کا نوکر اور کھاؤں اُدھار
میری تنخواہ کیجے ماہ بہ ماہ　　تا نہ ہو مجھ کو زندگی دُشوار
تم سلامت رہو ہزار برس　　ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

یقین ہے کہ اس کے بعد غدر تک انھیں یہ تنخواہ ہر مہینے ملتی رہی ہو گی کیوں کہ دوسری صورت میں ان کا ارادہ تھا کہ اگر تنخواہ ماہ بماہ نہ ملی تو اس خدمت کو میرا سلام ہے[۱]۔ اور وہ اس کے بعد بھی تاریخ نویسی کا کام کرتے رہے۔

استادِ ظفر جیسا کہ میرزا نے خود لکھا ہے[۲]۔ ۱۸۵۴ء میں ولی عہدِ سلطنت فتح الملک میرزا محمد سلطان غلام فخر الدین رمز عرف مرزا فخرو ان کے شاگرد ہوئے۔ ان کی سرکار سے چار سو روپیہ سالانہ تنخواہ مقرر ہوئی۔ اسی سال ۱۶ نومبر کو ذوقؔ نے وفات پائی اور بادشاہ نے بھی میرزا سے اصلاح لینا شروع کی۔ اگرچہ بقول مولانا حالیؔ "میرزا غالبؔ اس کام کو بادلِ ناخواستہ انجام کرتے تھے"[۳]۔ ان کے علاوہ ظفرؔ کے سب سے چھوٹے شہزادے میرزا خضر سلطان[۴] نے بھی ان کی شاگردی

---

[۱] نادراتِ غالبؔ صفحہ ۸ (مکتوبات)

[۲] اردوئے معلی صفحہ ۱۰۵ (بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ)

[۳] یادگارِ غالبؔ (حالیؔ)، صفحہ ۳۲

[۴] یہ وہی میرزا خضر سلطان ہیں جن کی پیدائش پر میرزا نے لکھا تھا۔

خضر سلطاں کو رکھے خالقِ اکبر سر سبز　　شاہ کے باغ میں یہ تازہ نہال اچھا ہے

اختیار کی اور غالبؔ اسی سال نوابؔ اجد علی شاہ کی طرف سے پانچ سو روپیہ سالانہ مقرر ہو گیا۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد وہ کسی حد تک اطمینان کی سانس لینے کے قابل ہو گئے ہوں گے مگر بد قسمتی سے یہ صورت زیادہ دن قائم نہ رہ سکی۔ دو برس بعد ۱۰ر جولائی ۱۸۵۶ء کو میرزا فخرو نے ہیضہ[1] سے انتقال کیا۔ ۱۱ر فروری ۱۸۵۶ء کو سرکار انگریزی نے نواب واجد علی شاہ کو تخت سے اُتار کر کلکتہ بھیج دیا جہاں وہ مٹیابرج میں نظر بند کر دیئے گئے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں "غدر" ہو گیا۔ میرزا خضر سلطان ستمبر ۱۸۵۷ء میں مقبرۂ ہمایوں میں گرفتار ہوئے اور دہلی کے باہر میجر ہاڈسن کی گولی کا نشانہ بنے۔ ظفر پر باغیوں کی اعانت کے جرم میں مقدمہ چلا اور وہ اکتوبر ۱۸۵۸ء میں رنگون بھیج دیئے گئے۔ جہاں ۷ر نومبر ۱۸۶۲ء کو ان کی وفات ہوئی۔ سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔

"غدر" اس ہنگامے کے مختصر حالات میرزا نے اپنی فارسی تصنیف دستنبو میں لکھے ہیں۔ لکھتے ہیں کہ ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو دیسی فوج شہر میں داخل ہوئی اور اسی دن میں نے مکان کا دروازہ بند کر کے باہر کی آمد و رفت ترک کر دی۔ لیکن اس میں انھوں نے مبالغہ کیا ہے۔ وہ خود ایک خط میں نواب محمد یوسف علی خاں والیٔ رامپور کو لکھتے ہیں[2]

---

[1] بعض مورخوں کا خیال ہے کہ مرزا فخرو ولی عہدی کے جھگڑوں اور رقابتوں کا شکار ہوئے اور ان کی موت زہر خورانی سے ہوئی تھی۔

[2] مکاتیب غالب صفحہ ۹ (مکاتیب)

"دریں ہنگامہ خود را بکنار کشیدم و بدیں اندیشہ کہ مبادا اگر یک قلم ترکِ آمیزش کنم، خانۂ من بتاراج رود، و جان در معرض تلف افتد، بباطن بیگانہ و بظاہر آشنا ماندم۔"

اس کے علاوہ بعض اور بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قلعہ بھی جایا کرتے تھے۔ دہلی پر قبضہ کرنے کے بعد دیسی سپاہ نے بہادر شاہ ظفر کے "شہنشاہِ ہندوستان" ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ میرزا نے دل میں سوچا خدا معلوم، اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اس لیے مصلحت اسی میں ہے کہ یکایک تعلقات منقطع نہ کیے جائیں۔

اس زمانہ میں میرزا بلی ماراں میں رہتے تھے۔ اسی محلے میں حکیموں کے مشہور شریف خانی خاندان کی سکونت تھی۔ چوں کہ یہ لوگ ریاست پٹیالہ میں ملازم تھے اس لیے مہاراجہ پٹیالہ نے انگریزوں سے کہہ کر اس محلے کے سرے پر دیوار کھنچوا دی، تاکہ باہر کا آدمی اندر نہ جانے پائے، اور اپنے آدمیوں کا پہرہ بٹھا دیا کہ کوئی فوجی گورا لوگوں کو دق نہ کر سکے۔ اس کے باوجود ان غریبوں کو طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا۔ اور تو اور انھیں اتنی جرأت نہ ہوئی کہ انگریزوں کے دہلی فتح کر لینے کے بعد ہی کوچہ بندی سے باہر جا کر پینے کا پانی تک لا سکیں۔ خوش قسمتی سے ایک دن ابرِ رحمت برسا اور ان لوگوں نے چادریں تان تان کر گھر بھر کے برتن بھر لیے۔

فساد شروع ہوتے ہی میرزا کی بیوی نے ان سے پوچھے بغیر اپنے تمام زیور اور قیمتی کپڑے میاں کالے صاحب کے مکان پر بھیج دیے تھے۔ انھیں خیال ہوگا کہ یہ چیزیں وہاں زیادہ محفوظ رہیں گی کیوں کہ ان کے ساتھ ایک طرح کا مذہبی تقدس وابستہ تھا اور گمان تھا کہ فوجی ان کا احترام کریں گے اور ان کا گھر

نہیں لوٹیں گے۔ مگر کالے صاحب کا مکان بھی وقفِ تاراج ہوا اور ان کے اپنے سامان کے ساتھ میرزا کی بیگم کا سامان بھی لٹ گیا۔[1]

اس ہنگامے میں دہلی کی اسلامی آبادی خاص طور پر قابلِ عتاب ٹھیری تھی۔ جو لوگ مجرم تھے، ان کے لیے تو ڈرنے کا مقام تھا ہی، دوسرے بے گناہ بھی جان و مال اور ناموس کی خاطر شہر چھوڑ چھاڑ کر بھاگ گئے۔ میرزا کے اکثر دوستوں پر یہی اُفتاد پڑی اور وہ مدتوں مصیبتوں کا نشانہ بنے مارے مارے پھرتے رہے۔

یہ ایام میرزا پر بھی نہایت مصیبت کے گذرے، آمدنی بالکل مفقود اور خرچ بدستور۔ بارے ان کے بعض ہندو دوستوں نے اس زمانے میں ان کی خبرگیری کی۔ منشی ہرگوپال تفتہ میرٹھ سے روپیہ بھیجا کیے۔ لالہ مہیش داس شراب مہیا کرتے رہے۔ ان کے علاوہ منشی ہیرا سنگھ دردؔ۔ پنڈت شیوجی رام اور ان کے لڑکے بال مکند نے بھی حتی الوسع ان کی خدمت میں کوتاہی نہیں کی۔ میرزا نے دستنبو میں ان سب کا ذکر کیا ہے۔[2] لکھتے ہیں کہ میں نے ان حضرات کا ذکر اس لیے کیا کہ جہاں ان کی عنایتوں کا شکر یہ مجھ پر واجب تھا، وہیں میں چاہتا ہوں کہ میرے دوسرے دوستوں کو بھی معلوم ہو جائے کہ میرے جیسا کثیر الاحباب شخص اس زمانے میں کیسے بسر کرتا رہا۔ اگر شہر میں یہ چاروں صاحب بھی موجود نہ ہوتے تو کوئی میری بے کسی کا گواہ تک نہ ہوتا۔

---

[1] کلیات نثر صفحہ ۴۰۹

[2] کلیات نثر صفحہ ۴۰۷-۴۰۹

لطیفہ

۵۔ اکتوبر ۱۸۵۷ء کو صبح کے وقت چند گورے کوچہ بندی کی دیوار پھاند کر محلے میں گھس آئے، مہاراجہ پٹیالہ کے سپاہیوں نے انھیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن ان کی ایک نہ چلی۔ گوروں نے لوگوں کے مال اسباب کو تو ہاتھ نہ لگایا، لیکن میرزا اور ان کے ہمسایوں میں سے چند آدمیوں کو پکڑ کے لے گئے، اور کرنیل براؤن (۹۔برن) کے سامنے پیش کر دیا۔ دراصل تفتیش ہو رہی تھی کہ شہر میں کون کون سے محلے میں مسلمان مقیم ہیں۔ کرنیل براؤن نے اِن لوگوں سے نام اور مقام اور پیشے وغیرہ کی کیفیت پوچھی۔ جب میرزا کی باری آئی تو اس نے ان کی کلاہِ پاپاخ اور ایرانی وضع پر حیران ہو کر ان سے پوچھا، "ول ٹم مسلمان ہے" انھوں نے جواب دیا، "حضور، آدھا" کرنیل براؤن حیران کہ یہ کیا کہتے ہیں۔ پوچھنے پر بولے، "قبلہ، شراب پیتا ہوں، سؤر نہیں کھاتا۔ اس لئے آدھا کہا ہے" سب ہنس پڑے۔ انھیں اور ان کے ساتھ دوسروں کو بھی ہنسی خوشی واپس آنے اور محلے میں بدستور مقیم رہنے کی اجازت مل گئی۔ رسیدہ بُود بلائے ولے بخیر گذشت[۵]

میرزا یوسف کی وفات

بدقسمتی سے انہی دنوں ان کے چھوٹے بھائی میرزا یوسف نے انتقال کیا۔ میرزا یوسف فراش خانے کے قریب سمرس کی گلی میں تنہا رہتے تھے اس ہنگامے میں ان کی بیوی اور لڑکی

---

[۵] یادگارِ غالب صفحہ ۳۶، نیز کلیاتِ نثر صفحہ ۳۹۶

میرزا کی ایک تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لطیفہ اور سوال جواب کرنیل براؤن سے پیش نہیں آیا تھا بلکہ راستے میں یہ گفتگو گورے سارجنٹ سے ہوئی تھی (انتخاب غالب صفحہ ۴۱)

انھیں اکیلا چھوڑ کر آپ بچوں سمیت جے پور چلی گئی تھیں[۱]۔ غالب ان کے اکیلے ہونے کے باعث بہت فکر مند تھے اور یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ انھیں اپنے پاس لے آئیں۔ میرزا یوسف کے ساتھ ایک بوڑھی ماما اور ایک بوڑھا ملازم تھے۔ ایک دن معلوم ہوا کہ گورے میرزا یوسف کے مکان میں گھس آئے تھے۔ پھر ایک صبح ملازم نے آ کے اطلاع دی کہ پانچ دن کے سخت بخار کے بعد آج رات میرزا یوسف نے انتقال کیا۔ یہ ۱۸ اکتوبر ۱۸۵۷ء (۲۹ صفر ۱۲۷۴ھ) کی رات کا ذکر ہے[۲]۔

جن حالات میں سے شہر اس وقت گزر رہا تھا۔ دو چار آدمیوں کا مل کر کسی نعش کو قبرستان تک دفن کرنے کے لیے لے جانا ممکن نہیں تھا۔ کفن اور گورکن کی تلاش مزید مصیبت۔ ہمسایوں نے میرزا کی بے کسی پر رحم کھایا۔ میرزا کے ملازم اور مہاراجہ پٹیالہ کا ایک سپاہی ان کے ساتھ گئے۔ کفن کے لیے دو تین سپید چادریں میرزا نے اپنے پاس سے دیں۔ ان لوگوں نے گلی کے سرے پر تہور خاں کی مسجد کے صحن میں گڑھا کھودا اور میت کو اس میں اتار کر مٹی سے پاٹ دیا[۳]۔

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۵ (بنام یوسف میرزا)، کلیات نثر (فارسی)، صفحہ ۲۹۳

[۲] یہ غالب کا اپنا بیان ہے (کلیات نثر صفحہ ۲۹۸) اس کے برخلاف معین الدین حسن خاں لکھتے ہیں کہ میرزا یوسف خاں جو مدتِ دراز سے حالتِ جنوں میں تھے، گولیوں کی آواز سن کر یکایک باہر نکلے اور مارے گئے (غدر کی صبح شام صفحہ ۹۸)، غالب کا بیان قابلِ ترجیح ہے۔

[۳] فراش خانے سے کھاری باؤلی کی طرف جائیں تو یہ مسجد نئے بانس کے متصل اُلٹے ہاتھ کو پڑتی ہے۔ اس کے بانی تہور خاں تاشکندی عہدِ محمد شاہی میں شاہجہان پور کے (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

غالب نے بھائی کے مرنے کی تاریخ کہی سہ

زسالِ مرگِ ستم دیدہ میرزا یوسف کہ زیستے بجہاں وز خویش بیگانہ

یکے در انجمن از من بھی پژوہش کرد کشیدم "آہے" و گفتم "دریغ دیوانہ"

۱۲۷۴ = ۱۶ - ۱۲۹۰

امراؤ بیگم کا وظیفہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ شروع ہونے کے ساتھ ہی میرزا کی آمدنی کے سب رستے بند ہو گئے۔ قلعے کی تنخواہ تو بند ہونا ہی تھی۔ وہاں تو دیسی فوج نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ایک غریب شاعر اور تاریخ نویس کس شمار قطار میں تھا۔ وہ تو اسی کی خیر منائیں کہ انھوں نے ان سے باز پرس نہیں کی، ورنہ کہیں یہ کہہ کر کہ یہ بھی انگریزوں کا وظیفہ خوار تھا، وہ انھیں بھی موت کے گھاٹ اُتار دیتے تو وہاں کون تھا جو ان کا ہاتھ روک لیتا۔ انگریزوں کی طرف سے جو خاندانی پنشن ملتی تھی۔ وہ بھی بند ہو گئی۔ کیوں کہ جب دیسی فوج نے دہلی پر قبضہ کر لیا تو انگریزی دفتر ہی کہاں رہا تھا، جہاں سے انھیں پنشن ملتی۔ یہ دیکھ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں نے میرزا کی بیوی جناب امراؤ بیگم کا پچاس روپیہ مہینا مقرر کر دیا۔ در اصل بالواسطہ یہ بھی میرزا ہی کی امداد تھی۔ یہ وظیفہ بیگم کو ان کی وفات تک ملتا رہا۔ میرزا رام پور سے ۲ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو حکیم ظہیر الدین احمد خاں کے نام لکھتے ہیں:سہ

(پچھلے صفحے سے آگے) زمیندار تھے۔ موجودہ مسجد نئی بنی ہے اب اس کی کرسی اونچی ہے اور صحن کے نیچے بازار میں دکانیں ہیں۔ گمان ہے کہ اس ردو بدل میں قبر مٹ گئی یا شاید نعش اس ہڑ بونگ میں منتقل کر دی گئی ہو جو اب بھی سرن کی گلی کے اندر موجود ہے۔

سہ اردوئے معلیٰ صہ ۱۷۴

"سنو میاں ظہیر الدین، تم اپنی دادی (بیگم غالب) کے پاس ابھی چلے جاؤ۔
اور ان سے میری اور دونوں لڑکوں کی خیر و عافیت کہو اور یہ پوچھو کہ
شہاب الدین خاں (خلف نواب ضیاء الدین احمد خاں) نے اکتوبر کے
مہینے کی تنخواہ کے پچاس روپے پہنچا دیے یا نہیں"[1]

یہاں اسی تنخواہ کی طرف اشارہ ہے۔

استاد نواب رام پور

اس ہنگامے سے تھوڑے ہی دن پہلے میرزا کا دربارِ رامپور سے تعلق قائم ہو گیا۔ اگرچہ یہ رشتہ بہت پرانا تھا یعنی جب بچپن میں نواب محمد یوسف علی خاں تعلیم کی خاطر دہلی تشریف لائے ہیں۔ تو انھوں نے میرزا غالب سے فارسی پڑھی تھی۔ مگر اس کے بعد یہ تعلقات منقطع ہو گئے۔ جب وہ ۱۸۵۵ء میں تخت نشین ہوئے تو میرزا نے قطعۂ تاریخ جلوس کے ذریعہ دوبارہ میل جول پیدا کرنا چاہا مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ جس زمانے میں مولانا فضل حق خیر آبادی رامپور میں تھے انھوں نے میرزا کو آمادہ کیا کہ وہ پھر نواب صاحب کی خدمت میں قصیدہ بھیجیں۔ اس پر میرزا نے ایک عریضہ لکھا اور قصیدہ بھی بھیجا۔[2] مولانا فضل حق نے بھی سفارش کی۔ چناں چہ اس کے جواب میں نواب فردوسِ مکاں نے ۵ر فروری ۱۸۵۷ء کو ایک خط میں چند شعر اصلاح کے لئے میرزا کے پاس بھیجے[3] اور اس طرح وہ باقاعدہ دربارِ

---

[1] مکاتیب غالب صفحہ ۳ (مکاتیب)

[2] قصیدہ نمبر ۵۴ (کلیات نظم)، یہ قصیدہ ایک رات میں لکھا گیا تھا۔

[3] مکاتیب غالب صفحہ ۱۲۰ (حواشی)

رام پور سے وابستہ ہو گئے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نواب صاحب نے اپنے اس ابتدائی کلام میں تخلص یوسف استعمال کیا تھا۔ میرزا نے ان کی خدمت میں لکھا:[1]

"میں نہیں چاہتا کہ آپ کا اسم سامی اور نامِ نامی تخلص رہے۔ ناظم، عالی، انور، شوکت، نیساں، ان میں سے جو پسند آئے، وہ رہنے دیں۔ مگر یہ نہیں کہ خواہی نہ خواہی آپ ایسا ہی کریں۔ اگر وہی تخلص منظور ہو تو بہت مبارک۔"

اس پر نواب صاحب نے لکھا کہ ہم نے ناظم تخلص پسند کیا۔[2]

یہ جدید تعلق پیدا ہوئے تین ماہ سے کچھ اوپر ہوئے تھے کہ یہ ہنگامہ ہو گیا۔ ابھی تک رام پور سے کوئی تنخواہ مقرر نہیں ہوئی تھی۔ البتہ نواب صاحب اکثر انھیں روپیہ بھیجتے رہتے تھے۔ چنان چہ پہلے ہی خط کے ساتھ انھوں نے ڈھائی سو روپے بھیجے تھے اور اس کے بعد بھی مسلسل امداد فرماتے رہے۔

سفرِ پٹیالہ کی تجویز

غالب کا خیال تھا کہ جونہی امن و امان قائم ہوا میری پنشن بھی بحال ہو جائے گی۔ مگر خلافِ امید ایک مدت تک یہ جاری نہ ہوئی۔ پہلے تو گھر کے کپڑے لتے بیچ بیچ کر دن کاٹے۔ مگر کب تک، آخر انھوں نے تنگ آ کر دہلی سے کہیں باہر چلے جانے کا فیصلہ کیا۔ نواب امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں اور ان کی والدہ ماجدہ بیگم جان صاحبہ

---

[1] مکاتیب غالب صفحہ ۶ (مکاتیب)

[2] ایضاً صفحہ ۱۲۱ (حواشی)

نے اس شرط پر ان کی تجویز سے اتفاق کیا کہ امراؤ بیگم اور بچے لوہارو چلے جائیں چنانچہ وہ نواب علاء الدین احمد خاں کو جو لوہارو میں تھے، اس امر کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔[۱]

"اپنا مقصود تمھارے والد ماجد سے اور تمھاری جدۂ ماجدہ سے اور تمھارے عمِ عالی مقدار سے کہہ چکا ہوں۔ خلاصہ یہ کہ میری بی بی اور بچوں کو کہ تمھاری قوم کے ہیں مجھ سے لے لو کہ میں اب اس بوجھ کا متحمل ہو نہیں سکتا انھوں نے بھی بشرط ان لوگوں کے لوہارو جانے کے اس خواہش کو قبول کیا۔ میرا قصد سیاحت کا ہے۔ پنشن اگر کھل جائے گا، تو وہ اپنے صرف میں لایا کروں گا، جہاں جی لگا وہاں رہ گیا۔ جہاں سے دل اُکھڑا چل دیا۔"

سیر و سیاحت تو خیر کیا ہونا تھی۔ دراصل وہ مالی مشکلوں اور خانگی ذمہ داریوں سے بہت گھبرا گئے تھے۔ ایسے حالات میں عموماً انسان اپنی ناکامی کے لئے کسی اور کو ذمہ دار ٹھیرانے لگتا ہے اور "زلہ بر عضوِ ضعیف" کے مصداق سب سے پہلے بیوی بچے اس کی نظر میں کھٹکتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ یہ ساری مصیبت قبیلہ داری کے باعث نازل ہوئی ہے۔ اگر میں اکیلا دم ہوتا تو مزے سے گذران ہوتی۔ سنے غمِ دزد دونے غمِ کالا۔ اب یہ "بیڑی" اور "ہتکڑیاں" ایسی ہیں کہ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ میرزا نے بھی یہی خیال کیا کہ ان تمام مشکلوں کے لئے میری خانگی زندگی ذمہ دار ہے اور اس مصیبت سے رہائی کی یہی صورت ہے کہ بیوی بچوں

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۳۱۴، خطوط غالب (۱=۳۲۱)

سے چھٹکارا کراؤں اور خود تنِ تنہا "رہیے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو"

جولا ابالیانہ طبیعت انھوں نے پائی تھی۔ اس کے پیشِ نظر وہ کسی قید اور پابندی کو بھی پسند نہیں کر سکتے تھے اور اہلی زندگی سے بڑھ کر اور کون سی پابندی ہوگی۔ اس لئے اگرچہ وہ پہلے بھی "شادی" اور "بیوی" کے خلاف لطیفہ بازی تو کرتے رہتے تھے لیکن ان کے کلام میں بیوی اور گرہستی کے موضوع پر جتنی چلی کٹی ہیں، وہ بیشتر اسی زمانے کی چیزیں ہیں۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی تہہ میں یہی جذبہ کام کر رہا ہے۔ یہ گویا اس "پابندی" اور "فقدانِ آزادی" کے خلاف احتجاج ہے جو "بیوی" کا لازمی نتیجہ ہے۔ ورنہ وہ عورت کے مخالف نہیں۔

تجویز یہ ہوئی تھی کہ بیوی بچوں کو لوہارو بھیج کر میرزا خود پٹیالے چلے جائیں اور وہاں گھریلو پریشانیوں سے آزاد ہو کر چندے عافیت سے رہیں۔

شریف خانی خاندان کے تین افراد یعنی حکیم محمود خاں اور حکیم مرتضیٰ خاں اور حکیم غلام اللہ خاں کو مہاراجہ نرندر سنگھ والیٔ پٹیالہ سے ملازمت کا تعلق تھا۔ حکیم محمود خاں تو دہلی میں رہتے تھے لیکن دوسرے دونوں بھائی پٹیالے میں مقیم تھے۔ میرزا دس برس تک دیوار بہ دیوار اس خاندان کے پڑوس میں رہے تھے اور ان کے آپس میں گہرے تعلقات تھے۔ انھیں حضرات نے کوشش کی کہ میرزا اگر پٹیالے چلے جائیں تو وہاں اطمینان سے رہیں گے۔ میرزا نے بھی ہامی بھر لی اور جانے پر رضامند ہو گئے۔ کلیات فارسی میں مہاراجہ نرندر سنگھ کی مدح میں جو قصیدہ ہے[۵] وہ غالباً

---

[۵] قصیدہ ۵۹ کلیات غالب (نظم فارسی)

اسی زمانے میں لکھا گیا تھا۔ لیکن بعد میں انھوں نے یوں بیوی بچّوں کو چھوڑ کر چلے جانے میں اپنی ذلّت اور سُبکی دیکھی اور جانے سے انکار کر دیا چنانچہ حکیم غلام نجف خاں کو لکھتے ہیں:ؔ

"بھائی میرا دُکھ سنو۔ ہر شخص کو غم موافق اس کی طبیعت کے ہوتا ہے۔ ایک تنہائی سے نفور ہے، ایک کو تنہائی منظور ہے۔ تاہل میری موت ہے۔ میں کبھی اس گرفتاری سے خوش نہیں رہا۔ پٹیالے جانے میں ایک سبکی اور ذلت تھی۔ اگرچہ مجھ کو دولتِ تنہائی میسر آجاتی لیکن اس تنہائیِ چند روزہ اور تجریدِ مستعار کی کیا خوشی۔"

عین ممکن ہے کہ پٹیالے جانے میں ایک اور بات بھی حائل ہوئی ہو۔ رامپور کا تعلق ابھی تازہ بات تھی۔ وہ نواب فردوس مکان کے استاد مقرر ہو چکے تھے۔ پس پٹیالے جانے میں صرف ان کی اپنی ہی "ذلت اور سبکی" نہیں تھی بلکہ اس سے نواب رامپور پر بھی حرف آتا تھا جو ان کے شاگرد تھے۔

رام پور کا مشاہرہ

لیکن اس سے اصل مشکل تو حل نہیں ہو سکتی تھی۔ سوال یہ نہیں تھا کہ "رہیں کہاں؟" بلکہ یہ کہ "کھائیں گے کیا؟" اس کا ایک ہی علاج تھا کہ نواب رامپور کی طرف سے انھیں ایک مقررہ رقم باقاعدہ ہر مہینے ملتی رہے۔ اخیر مجبور ہو کر انھوں نے نواب یوسف علی خاں کی خدمت میں لکھا کہ میرا کچھ مستقل وظیفہ مقرر کر دیا جائے۔ اس پر نواب صاحب نے

ؔ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۸، خطوطِ غالب (۱ ء ۲۲۰)

۱۶ر جولائی ۱۸۵۹ء کو جواب دیا کہ آئندہ آپ کو سو روپے تنخواہ ہر ماہ پہ پہنچتی رہے گی۔[1]

پنشن کی بندش دہلی میں شورش ۱۱ر مئی ۱۸۵۷ء کو ہوئی، جب دیسی فوج شہر پر قابض ہو گئی۔ انھوں نے جو تباہی مچائی، اس کا کچھ حال میرزا نے دستنبو میں لکھا ہے۔ انھوں نے انگریزوں ہی کے قتل اور ان کے اموال کی لوٹ پر بس نہیں کی بلکہ ہندستانی امرا، اور ان کی املاک پر بھی ہاتھ صاف کیا۔ ۸ر ستمبر ۱۸۵۷ء کو دہلی پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہو گیا۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ گرفتاریوں اور سزاؤں کا بازار نئے سرے سے گرم ہو۔ چنانچہ جو کالوں کے ہاتھ سے بچا تھا وہ گوروں کا شکار ہوا جس شخص سے متعلق معمولی سا شبہہ بھی ہوا کہ وہ باغیوں سے ہمدردی رکھتا تھا انھوں نے اسے پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا۔

غالب نے غدر کے زمانے میں انگریزوں کی کوئی خاص خیر خواہی نہیں کی تھی، کہ انھیں کسی نئے انعام کی توقع ہوتی لیکن ان کے خیال میں ان سے کوئی بیوفائی بھی نہیں ہوئی تھی۔ جو پرانے تعلقات کو درہم برہم کرنے والی ہو۔[2] اسی لیے انھیں یقین تھا کہ امن قائم ہوتے ہی میری پنشن اور دربار بحال کر دیے جائیں گے۔ مگر اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ قیامِ امن کے بعد جب انھوں نے سلسلہ جنبانی

---

[1] مکاتیب غالب صفحہ ۸۲ دیباچہ، اردوے معلی صفحہ ۱۳۰، خطوط غالب (۱ = ۲۶۲)

[2] ایضاً صفحہ ۱۶ (مکاتیب)

کی تو جواب ملا کہ "ایامِ غدر میں تم باغیوں سے اخلاص رکھتے تھے اب گورنمنٹ سے کیوں ملنا چاہتے ہو؟"[۱] غرض کہ نہ پنشن جاری ہوئی، نہ دربار ہی کھلا۔

سکّہ کا الزام غالب پر سب سے بڑا الزام یہ تھا کہ جب باغیوں نے بہادر شاہ کی بادشاہت کا اعلان کیا ہے تو تم نے اُن کے لئے سکہ کہہ کر دیا تھا۔ میرزا کے اردو خطوں میں کئی جگہ اس کا ذکر آیا ہے۔

قصہ یوں ہے کہ غدر کے ایام میں ایک جاسوس گوری شنکر نے انگریزوں کو خفیہ اطلاع دی[۲] کہ ۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو جب بہادر شاہ نے دربار کیا تو میرزا غالب نے یہ سکہ کہہ کر ایک پرچہ پر لکھا اور حضور میں گزرانا ؎

بزر زد سکۂ کشور ستانی سراج الدین بہادر شاہ ثانی

غدر کے بعد جب میرزا، صاحب کمشنر بہادر کی ملاقات کو گئے، تو انھوں نے ان سے اس سے متعلق پوچھا۔ غالب نے جواب دیا[۳]:

"(یہ شخص) غلط لکھتا ہے۔ بادشاہ شاعر، بادشاہ کے بیٹے شاعر، بادشاہ

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۱۱ (بنام خواجہ غلام غوث خاں بیخبر)

[۲] میں نے یہ واقع ایک غیر مطبوعہ تحریر سے لیا ہے اس سلسلے میں دیکھئے "غدر کی صبح شام" (صفحہ ۸۵) جہاں لکھا ہے، کہ مرزا عباس لکھنوی نے بہادر شاہ ظفر کی خدمت میں اشرفیاں نذر بھیجیں، جن پر یہ شعر کندہ تھا ؎

بزر زد سکۂ نصرت طرازی سراج الدین بہادر شاہ غازی

کہیں گوری شنکر نے اسی شعر کو تو معمولی تغیر کر کے اور بزر زد بنا کر غالب سے منسوب نہیں کر دیا؟

[۳] علی گڑھ میگزین (غالب نمبر ۱۹۴۹) بلاک ۵ مقابل صفحہ ۲۸

کے ذکر شاعر۔ خدا جانے کس نے کہا، اخبار نویس نے میرا نام لکھ دیا۔
اگر میں نے کہہ کر گزرانا ہوتا تو دفتر سے وہ کاغذ میرے ہاتھ کا لکھا ہوا
گذرتا۔"

بعد میں ایک دوست نے انھیں بتایا کہ جب بہادر شاہ تخت پر بیٹھے ہیں تو یہ سکہ ذوقؔ نے کہہ کر پیش کیا تھا اور نہ صرف یہی بلکہ ایک اور بھی[۱] چوں کہ بہادر شاہ ۳۰ ستمبر ۱۸۳۷ء کو تخت پر بیٹھے ہیں۔ اسی لئے وہ دوستوں سے ۱۸۳۷ء کے اخبار اور خصوصاً مولوی محمد باقر (والد مولانا محمد حسین آزادؔ) کا اخبار مسمّٰی بہ دہلی اردو اخبار مانگتے تھے۔ کیوں کہ ذوقؔ اور مولوی محمد باقر میں گہری ملت تھی اور یہ سکے ان کے اخبار میں شائع ہوئے تھے[۲]۔ مگر نہ یہ اخبار ملا اور نہ وہ اس الزام سے اپنی بریت ثابت کر سکے۔

رام پور کا پہلا سفر

نواب یوسف علی خاں نے میرزا کو رام پور آنے کے لئے متعدد بار دعوت دی تھی یہ یوں معلوم ہوتا ہے، کہ دہلی پر دوبارہ انگریزی قبضہ ہونے کے ساتھ ہی انھوں نے میرزا کو رام پور آنے کے لئے لکھا تھا لیکن یہ کسی وجہ سے نہ جا سکے۔ دوسری بار انھوں نے ۲۵ نومبر ۱۸۵۹ء

---

[۱] دوسرا سکہ غالباً یہ تھا ؎

بسیم و زر زدہ شد سکۂ بفضلِ الٰہ سراجِ دین ابوظفر شہ بہادر شاہ

[۲] اردوئے معلی صہ ۹۹، ۱۰۲ (مترور)، ایضاً صہ ۲۵۵ خطوط غالب ۱۵۶=۱

(یوسف میرزا)

کو بُلایا تو میرزا نے جواب دیا[1]

"میرے حاضر ہونے کو جو ارشاد ہوتا ہے۔ میں وہاں نہ آؤں گا تو کہاں جاؤں گا۔ پنسن کے وصول کا زمانہ قریب آیا ہے۔ اس کو ملتوی چھوڑ کر کیوں کر چلا آؤں۔ سُنا جاتا ہے اور یقین بھی آتا ہے کہ جنوری آغاز سال ۵۹ عیسوی یہ قصہ انجام پائے۔ جس کو روپیہ ملنا ہے اُس کو روپیہ، جس کو جواب ملنا ہے اُس کو جواب مل جائے۔"

مگر جنوری ۱۸۵۹ء آیا اور گذر بھی گیا اور پنشن کا فیصلہ ہونا تھا نہ ہوا اِس پر نواب فردوس مکان نے ۲۔ فروری اور ۱۳ اپریل ۱۸۵۹ء کو تجدیدِ دعوت کی، اس کے جواب میں غالب نے ۱۸ اپریل کو لکھا[2]

"پہلے خط میں یہ عرض کیا ہے کہ مجموع پنسنداروں کی مثل مرتب ہے، اور ہنوز صدر کو روانہ نہیں ہوئی۔ نواب گورنر جنرل لارڈ کیننگ بہادر نے کلکتہ سے میری پنسن کے کاغذ طلب کیے، اور وہ کاغذ فہرست میں سے الگ ہو کر لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب کی خدمت میں ارسال ہوئے۔ وہاں سے کلکتے کو بھیجے جائیں گے۔ پھر وہاں سے حکم منظوری پنجاب ہوتا ہوا یہاں آئے گا اور یہاں مجھ کو روپیہ مل جائے گا۔ آج روپیہ

---

[1] مکاتیب غالبؔ صد ۱۲۔ مکاتیب نواب فردوس مکان کی دعوت کے خط دیباچے کے صد ۸۸-۸۹ پر درج ہیں۔

[2] ایضاً صد ۱۳-۱۴ (مکاتیب)

ملا، کل میں نے آپ سے سواری اور بار برداری مانگی۔ آج سواری اور
بار برداری پہنچی، اور کل میں نے رام پور کی راہ لی۔"

۱۸۵۹ء کا سارا سال گذر گیا اور میرزا کو روپیہ نہ ملا۔ مگر امید ابھی قائم تھی جنوری ۱۸۶۰ء کے شروع میں گورنر جنرل لارڈ کیننگ میرٹھ میں دربار کرکے دہلی پہنچے۔ جب یہ قیام گاہ پر گئے، تو وہاں سے جواب ملا کہ ہم ملاقات نہیں کرنا چاہتے۔[1] اس سے میرزا بالکل مایوس ہو گئے۔ اور انھوں نے رام پور جانے کا فیصلہ کرلیا۔ نواب صاحب بھی انھیں پھر وسط دسمبر ۱۸۵۹ء میں رام پور آنے کے لیے لکھ چکے تھے۔[2] جب حکومت کی طرف سے انھیں یہ آخری جواب ملا تو وہ ۱۹ر جنوری ۱۸۶۰ء کو دہلی سے روانہ ہو کر۔[3] ۲۷ر جنوری کو رام پور پہنچ گئے۔[4]

قیامِ رام پور میرزا اس سفر میں زین العابدین خاں عارف کے دونوں صاحبزادوں، باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو بھی اپنے ساتھ لیتے گئے تھے۔ نواب صاحب نہایت تعظیم و تکریم سے پیش آئے، میرزا نے لڑکوں سے بھی نذر دلوائی۔[5] پہلے نواب صاحب نے اپنی "خاص کوٹھی" "قیام

---

[1] اردوئے معلیٰ صہ ۲۱۱ (بنام منشی غلام غوث خاں بیخبر)

[2] مکاتیب غالب صہ ۹۱ (دیباچہ)

[3] اردوئے معلیٰ صہ ۶۲ - ۶۳ (بنام تفتہ)، ایضاً صہ ۱۷۳ (بنام غلام نجف خاں)

[4] ایضاً صہ ۱۷۰ (بنام غلام نجف خاں)، خطوط غالب (۱: ۲۲۵)

[5] اردوئے معلیٰ صہ ۱۲۰، خطوط غالب (۱: ۲۶۲) (بنام میر مہدی مجروح)

کے لئے دی۔ چوں کہ ان کے ساتھ بچے تھے اس لئے یہ ڈرے کہ کہیں شوخی اور نادانی سے یہ ساز و سامان وغیرہ نہ توڑ پھوڑ دیں۔ چناں چہ چار دن کے بعد ان کی اپنی درخواست پر انھیں محلہ راج دوارہ میں ایک وسیع مکان دے دیا گیا۔[1] شروع میں کھانا دونوں وقت سرکار سے آتا رہا۔[2] لیکن بعد میں سو روپیہ ماہانہ دعوت کا مقرر ہو گیا۔ یعنی دہلی میں رہیں تو صرف سو روپیہ تنخواہ اور رام پور میں رہیں تو سو روپیہ دعوت کا ملا کر دو سو روپیہ ماہانہ۔[3] رام پور کی آب و ہوا وغیرہ سب کچھ میرزا کی خاطر خواہ تھا اور ان کا ارادہ تھا کہ گرمی اور برسات کا موسم رام پور ہی میں رہیں، مگر صاحبزادوں نے واپس دہلی جانے کے لئے ضد کی۔ میرزا نے انھیں تنہا بھیجنا مناسب خیال نہ کیا کہ کہیں راستے میں کوئی حادثہ پیش آ جائے تو عمر بھر کی بدنامی رہے کہ دیکھو اپنے عیش و آرام کی خاطر بچوں کا خیال نہ کیا اور انھیں اکیلے بھیج دیا۔ اس لئے انھوں نے خود بھی ان کے ساتھ چلے آنے کا فیصلہ کر لیا۔ آخر نواب صاحب سے اجازت لے کر ۱۷ مارچ ۱۸۶۰ء کو روانہ ہوئے اور ۲۴ مارچ (۳۰ شعبان ۱۲۷۶ھ) کو دہلی پہنچے۔ جس دن دہلی پہنچے اسی دن روزوں کا چاند ہوا۔[4]

---

[1] مکاتیب غالب صفحہ ۹۷ (دیباچہ) اس مکان پر ایک یادگاری پتھر نصب کر دیا گیا ہے۔

[2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۷۰ (بنام حکیم غلام نجف خاں)

[3] ایضاً صفحہ ۱۲۰ (بنام میر مہدی مجروح)

[4] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۵۸، خطوط غالب (۱=۱۴۷) (بنام یوسف مرزا)

پنشن کی بحالی مارچ ۱۸۵۹ء میں یہ فیصلہ ہوا تھا کہ جو لوگ غدر سے پہلے سرکاری خزانے سے وظیفہ یا پنشن پاتے تھے انھیں مدد کے طور پر ایک ایک سال کی رقم فوراً دے دی جائے۔ جب تحقیقات مکمل ہو جائے گی تو بقیہ ادا کر دیا جائے گا۔ اس زمانے میں غالب کو صرف سو روپے ملے تھے۔ جب انھوں نے شکایت کی کہ صاحب دوسروں کو سال سال بھر کا وظیفہ دیا جا رہا ہے میں صرف سو روپے نہیں لیتا۔ دینا ہے تو مجھے بھی سال بھر کے ساڑھے سات سو دلوائیے، تو انھیں جواب ملا کہ نہ معلوم دوسروں کے بقیہ کا فیصلہ کب تک ہو آپ کو تو جلد ہی مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر آج تک کا تمام چڑھا ہوا روپیہ مل جائے گا۔ اس پر انھوں نے وہ سو روپے لے لئے۔ مگر نہ معلوم کیا پیچ پڑا کر اس کے بعد نہ صرف بقایا ہی نہ ملا۔ بلکہ جنوری ۱۸۶۰ء میں وہ مایوس کن جواب ملا جس سے گھبرا کر وہ رام پور چلے گئے۔ اگرچہ وہ نواب صاحب کی دعوت پر وہاں گئے تھے۔ مگر جیسا کہ انھوں نے منشی شیو نرائن کو لکھا ہے، وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ نواب صاحب کے ذریعہ حکومت سے اپنی صفائی کرا لیں[1]۔ نواب صاحب نے بھی وقتاً فوقتاً انگریز افسروں سے اپنی ملاقاتوں میں ان کا ذکر کیا تھا۔ وہ غالب کو ایک خط میں لکھتے ہیں[2]۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۸۱ (بنام شیو نرائن) نیز دیکھو صفحہ ۱۷۱ (بنام حکیم غلام نجف علی خاں)، یہ خط انھوں نے رام پور سے لکھا تھا اور اس میں کہتے ہیں کہ میں نواب یوسف علی خاں کے ساتھ گورنر غرب و شمال کی ملاقات کے لئے مراد آباد جاؤں گا۔

[2] مکاتیب غالب صفحہ ۹۰ (دیباچہ)

"مشفقا! ہنگامِ ملاقات کے اکثر بعضے صاحبان بہادر ذی شان سے تذکارِ محامدِ اوصافِ ذاتی اور صفاتی آپ کا عمل میں آیا ہے! اللہ تعالےٰ کے فضل اور قدردانیٔ سرکارِ دولت مدار سے بیقینِ واثق ہے کہ جو ملاحِ شریف آپ کے قدیم سے ہیں۔ پیشگاہ گورنمنٹ بہادر سے بھی اسی مطابق ظہور میں آوے گا۔ کس واسطے کہ اہالیِ سرکارِ ابد قرار قدردان و قدر شناس ہیں۔"

اس سے قطعی ثابت ہوتا ہے کہ واقعی نواب صاحب بھی کوشش کر رہے تھے اور میرزا نے یوسف مرزا کو جب یہ لکھا[۱] کہ "والیِ رامپور کو اس پنشن کے اجرا میں کچھ دخل نہیں یہ کام خدا ساز ہے۔ بہ علی ابن ابی طالب علیہ السّلام" تو یہ محض شاعرانہ مبالغہ تھا۔ بہرحال سبب کچھ ہو پنشن کا تمام بقایا روپیہ مئی ۱۸۶۰ء میں مل گیا۔ جب ۱۱ رمئی کو غدر ہوا ہے تو وہ اپریل ۱۸۵۷ء کی پنشن وصول کر چکے تھے۔ ساڑھے سات سو سال کے حساب سے مئی ۱۸۵۷ء سے لے کر اپریل ۱۸۶۰ء تک تین برس کے دو ہزار دو سو پچاس ہوئے۔ سو روپے مدِ خرچ کے وہ مارچ ۱۸۵۹ء میں لے چکے تھے۔ باقی دو ہزار ایک سو پچاس انھیں ۴ر مئی ۱۸۶۰ء کو ملے۔ ان میں سے ڈیڑھ سو انھوں نے عملۂ دفتر کو بطور انعام دے دیا۔ باقی رہ گئے دو ہزار۔ اصل اور سود ملاکران کو پندرہ سو روپے اپنے مختار کار کے دینا تھے۔ اس کے علاوہ ہزار گیارہ سو متفرق قرض تھا۔[۲]

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۲۴۶ (بنام یوسف مرزا)، خطوطِ غالب (۱ = ۱۶۹)

[۲] اردوئے معلی صفحہ ۶۶ (بنام مرزا تفتہ)، صفحہ ۱۳۵ (بنام مجروح)، عودِ ہندی صفحہ ۸۸ (مجروح)

بہت ضروری قرض ادا کر دینے کے بعد پھر بھی چار سو روپیہ ان کے ذمہ واجب الادا رہا اور ان کے پاس صرف ستاسی روپے گیارہ آنے بچے۔ ساتھ ہی یہ حکم ہوا کہ اب مئی کے بعد پنشن دار عموماً ششماہی پایا کریں اور پنشن ماہ بماہ تقسیم نہ ہوا کرے[۱]۔ لیکن اس حکم پر عمل دسمبر ۱۸۶۰ء سے شروع ہوا۔ اس کے علاوہ دوسرا حکم یہ ہوا کہ آئندہ چار روپیہ سینکڑہ سالانہ وضع ہوا کرے گا۔ اس حساب سے گویا انھیں اس کے بعد ساڑھے باسٹھ کی جگہ صرف ساٹھ روپیہ مہینہ ملتے رہے[۲]۔ لیکن سب سے بڑی مشکل "چھ ماہی ادائی" کی تھی، کیوں کہ صرف رامپور کے سو روپوں پر ان کا گذارا ناممکن تھا اس لیے "ناچار وہ ہر مہینے" ساہوکار سے سود کاٹ کے قرض لیتے اور لے رامپور کی آمد میں ملا کر صرف میں لاتے۔ یہ سود اسی طرح چھ مہینے تک کنڈاں دینا پڑتا اور یوں ایک معقول رقم گھاٹے میں جاتی[۳]۔

یہاں ہم ایک ناقابلِ فہم معمّے سے دوچار ہوتے ہیں۔ غالبؔ نے غدر سے پہلے ۲۹ مئی ۱۸۵۳ء کو ایک خط حقیرؔ کے نام لکھا ہے۔ اس میں انھیں اطلاع دیتے ہیں[۴]۔

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۲۹۷-۲۹۸ (بنام علاء الدین احمد خاں)، خطوط غالب (۱ = ۳۲۲)

[۲] ایضاً صفحہ ۱۰۳ (بنام چودھری عبدالغفور سرورؔ)

[۳] ایضاً صفحہ ۵۵ (بنام ہرگوپال تفتہؔ)، خطوط غالب (۱ = ۷۶)

[۴] نادرات غالب صفحہ ۴۲ (مکتوبات) نیز اردوئے معلی صفحہ ۱۹ (بنام ہرگوپال تفتہؔ) خطوط غالب (۱ = ۱۴)

"ایک نئی بات سنو۔ شہر میں ایک وبا آئی ہے یعنی وکیلِ کمپنی بے سنینِ ماضیہ کے کاغذ دیکھ کر رسومِ سرکاری جس شخص سے لینی تھیں اس کا مطالبہ کیا ہے،' اور مطالبہ کیا،' مواخذہ یعنی بہت شدت۔ از انجملہ مجھ پر بھی بابت رسمِ سرکاری پانسو روپے آٹھ آنے نکلے اور اس کی طلب بقیدِ حکمِ قید ہوئی۔ میں آٹھ آنے کو محتاج،' پانسو کہاں سے لاؤں۔ بارے حضرت،' انگریزی تنخواہ میں سے پانچ روپے مہینہ بطریقِ قسط مقرر کر دیا۔ باسٹھ روپے آٹھ آنے مہینہ پاتا تھا۔ ستاون روپے آٹھ آنے رہ گئے۔ پانچ روپے مہینہ کا ساٹھ روپے سالیانہ ہوا۔ اب یہ توقع کہاں کہ پوری تنخواہ پاؤں گا یوں سمجھے کہ ستاون روپے کا پنشن دار ہوں۔"

ان کے کسی خط سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ غدر سے پہلے بھی انھیں ساڑھے باسٹھ سے کم ملتے ہوں۔ اگر یہ پانچ روپے مہینے کی کاٹ مستقل تھی تو پانسو، واجب الادا کہیں دس برس میں جاکر ختم ہوتا اور انھیں اب بھی ساڑھے باسٹھ نہیں مل سکتے تھے اس کے ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں کہ غدر سے پہلے کہیں سے کوئی فتوح آگئی ہو اور انھوں نے یہ ٹکس کا تمام روپیہ یک مشت ادا کر دیا ہو اور اس کے بعد پنشن پہلے کی طرح پوری ملنے لگی ہو۔ بہر حال میرزا کے کسی دوسرے خط میں ان رسوم سرکاری کے ختم ہونے کا ذکر نہیں۔

دربار و خلعت کی بحالی جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے[1] میرزا کی عمر تیس برس کی تھی، جب ۱۸۲۸ء میں لارڈ بینٹنک کے

---

[1] دیکھو اوپر صہ ۷۹

زمانے میں انھیں دربار کا اعزاز ملا۔ خلعت لارڈ الن برا کے عہد (۱۸۴۲ء تا نغایت ۱۸۴۴ء) میں جاری ہوا۔ اس میں سات پارچہ اور تین رقم جواہر (یعنی جیغہ د سر پیچ و مالائے مروارید) ہوا کرتے تھے۔ ۲۷ نومبر ۱۸۵۹ء کو نواب یوسف علی خاں کو لکھتے ہیں:[۱]

"میں انگریزی سرکار میں علاقہ ریاست دو دمانی کا رکھتا ہوں۔ معاش اگرچہ قلیل ہے مگر عزّت زیادہ پاتا ہوں۔ گورمنٹ کے دربار میں داہنی صف میں دسواں نمبر اور سات پارچے اور جیغہ، سر پیچ، مالائے مروارید خلعت مقرر ہے۔ لارڈ ہارڈنگ صاحب کے عہد تک پایا۔ لارڈ ڈلہوسی یہاں آئے نہیں" (مراد یہ کہ میں ان کے کسی دربار میں شامل نہیں ہوا)۔

میرزا جب کسی دربار میں شریک ہوتے تو نقد رقم کی جگہ بطور نذر قصیدہ یا مدحیہ قطعہ یا کوئی نظم پیش کیا کرتے تھے۔[۲] سرکاری خط و کتابت میں ان کا القاب "خان صاحب بسیار مہربانِ دوستان" ہوتا تھا۔ ایک بار اڈمنسٹن صاحب چیف سکریٹری نے یہ القاب بڑھا کر "خان صاحب مشفق بسیار مہربانِ مخلصان" لکھا تو اس پر میرزا نے احسان مندی کا اظہار کیا۔[۳] تمام سرکاری

---

[۱] مکاتیب غالب صفحہ ۱۵ (مکاتیب)، نیز اردوے معلی صفحہ ۴۰۶ (بنام سید غلام حسنین قدر بلگرامی)، خطوط غالب (۱ = ۱۹۴)

[۲] اردوے معلی صفحہ ۱۸ (بنام مرزا تفتہ)، خطوط غالب (۱ = ۸۷)

[۳] اردوے معلی صفحہ ۱۹۶ (بنام حاتم علی مہر)، خطوط غالب (۱ = ۲۰۳)

خط وکتابت افشانی کاغذ پر ہوا کرتی تھی۔[1]

جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن کھل گئی۔ تو اب انھوں نے دربار اور خلعت کی بحالی کی کوشش شروع کی۔ چنانچہ یکم جون ۱۸۶۲ء کی درخواست میں انھوں نے لکھا کہ مجھے[2] لارڈ ولیم بینٹنک کے عہد سے دربار کا اور لارڈ ہلن برا کے عہد سے خلعت ہفت پارچہ و سہ رقوم جواہر کا اعزاز حاصل تھا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ اس عزت و توقیر میں اضافہ ہوتا۔ مگر اب کہ میری عمر ۶۷ برس ہے (بحساب قمری) اس کے برخلاف وہ پہلا دربار اور خلعت بھی چھن گیا ہے۔ میں غدر کے دنوں میں بھی وفادار رہا۔ پنشن کا اجرا ہی میری بے گناہی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ پھر نہ معلوم مجھ سے دربار کا حق کیوں چھین لیا گیا ہے۔ پس میرے معاملات کی تفتیش کی جائے اور اگر یہ ثابت ہو جائے کہ میں بے قصور ہوں تو میرا دربار اور دوسرے اعزاز و اکرام بحال کیے جائیں۔

بارے یہ کوششیں بر دان چڑھیں اور ۳ مارچ ۱۸۶۳ء کو دربار و خلعت بھی پھر سے جاری ہو گیا۔[3] میرزا اس کی تفصیل ایک خط میں یوں لکھتے ہیں:[4]

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۹۶ (سرور) نیز مکاتیب غالب صفحہ ۲۵ (مکاتیب)

[2] یہ سارا مضمون غیر مطبوعہ تحریروں پر مبنی ہے۔

[3] مکاتیب غالب صفحہ ۲۴ (مکاتیب)

[4] اردوئے معلی صفحہ ۴۰۶-۴۰۷ (بنام قدر بلگرامی) خطوط غالب (ا، ۱۹۴)

"غدر کے بعد پنسن جاری ہو گئی۔ لیکن دربار اور خلعت بند۔ اب کے جو لارڈ صاحب یہاں آئے تو اپلِ دفتر نے بموجب حکم کے مجھ کو اطلاع دی کہ تمھارا دربار اور خلعت واگزاشت ہو گیا۔ مگر دلّی میں دربار نہیں، انبالے آؤ گے تو دربار میں نمبر اور خلعت معمولی پاؤ گے۔ میں نے خبر میں وجدان کا مزا پایا اور انبالے نہ گیا۔ رابرٹ منٹگمری صاحب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب یہاں آئے۔ دربار کیا، میں دربار میں گیا، دربار کے بعد ایک دن بارہ بجے چپراسی آکر مجھ کو بلا لے گیا۔ بہت عنایت فرمائی، اور اپنی طرف سے خلعت عطا کیا۔"

لیکن اس خط میں ان سے ایک غلطی ہو گئی ہے۔ دوسری جگہ منشی ہرگوپال تفتہ کے خط میں انھوں نے درست لکھا ہے کہ لارڈ الگن گورنر جنرل کے دربار انبالہ کی خبر اور اس میں شمولیت کی صلاح خود سر رابرٹ منٹگمری نے دی تھی[۱]۔ مگر وہ ہاتھ پر پھوڑا نکل آنے کے سبب انبالے نہ جا سکے[۲] اور قصیدہ بذریعہ ڈاک بھیج دیا[۳]۔

---

[۱] اردوئے معلیٰ صہ ۱۸ (اس خط کے آخر میں میرزا تاریخ میں غلطی کر گئے ہیں لکھا ہے ۳ ر رمضان مطابق ۴ ر فروری ۶۳ء یہاں فروری کی جگہ مارچ ہونا چاہیے) نیز مکاتیب غالب صہ ۲۴ (مکاتیب)

[۲] اردوئے معلیٰ صہ ۱۸، خطوط غالب (۱ = ۷۰، (بنام تفتہ)

[۳] یہ قصیدہ سبد چین میں موجود ہے، قصیدہ نمبر ۱

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں[۱]۔

"جن لوگوں نے میرزا مرحوم کی صفائی کے لیے خاص طور پر کوشش کی تھی، مجھے معتبر ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں سرسید مرحوم بھی تھے۔ اس واقعے سے سید صاحب اور میرزا مرحوم میں صفائی بھی ہو گئی، جن کے باہمی تعلقات قضیہ آئینِ اکبری کی تقریظ کے قصے سے کچھ مکدر ہو گئے تھے۔"

مولانا حالی کے بیان کے مطابق یہ کشیدگی اس زمانے میں دور ہوئی، جب میرزا رام پور کے پہلے سفر سے واپس آتے ہوئے، مارچ ۱۸۶۰ء میں مراد آباد میں ٹھیرے ہیں۔ سرسید ان دنوں یہاں صدر الصدور تھے۔ وہ انھیں سرائے سے اپنے یہاں اٹھوا لے گئے۔ یہیں وہ لطیفہ پیش آیا کہ سرسید نے میرزا کی شراب کی بوتل (جو گھر میں داخل ہوتے وقت ان کے ہاتھ میں تھی) اُٹھا کر اسباب کی کوٹھری میں رکھ دی۔ میرزا نے جب بوتل موجود نہ پائی تو گھبرا کر پوچھا میری بوتل کیا ہوئی۔ سرسید نے اطمینان دلایا، لیکن میرزا نہ مانے اور اسے دیکھنے پر اصرار کیا۔ اس پر سرسید نے انھیں کوٹھری میں لے جا کر بوتل دکھائی۔ میرزا نے بوتل ہاتھ میں لی اور کہا۔ اس میں تو کچھ خیانت ہوئی ہے۔ سچ سچ بتاؤ کس نے پی ہے۔ شاید اسی لیے تم نے یہ کوٹھری میں لا رکھی تھی۔ حافظ نے سچ کہا ہے ؎

---

[۱] الہلال - ۱۷ جون ۱۹۱۴ء (میرزا غالب کا غیر مطبوعہ کلام)

واعظاں، کیں جلوہ بر محراب و منبر می کنند
چوں بہ خلوت می روند، آں کارِ دیگر می کنند

یہ واقعہ بیان کر کے حالی مرحوم لکھتے ہیں:۔[1]

"سرسید ہنس کر چپ ہو رہے اور اس طرح وہ رُکاوٹ جو کئی برس سے چلی آتی تھی، رفع ہو گئی۔ میرزا دو ایک دن وہاں ٹھہر کر دتی چلے آئے۔"

اگرچہ یہاں مولانا حالی سے یہ غلطی ہو گئی ہے کہ انھوں نے مراد آباد کے قیام کا زمانہ دو تین دن قرار دیا ہے کیوں کہ میرزا غالباً اسی دن وہاں سے روانہ ہو گئے تھے، لیکن اس سے ایک بات ثابت ہے کہ سرسید سے ان کی صفائی مارچ ۱۸۶۰ء میں ہو گئی تھی نہ کہ ۱۸۶۳ء میں، جب ان کا دربار و خلعت بحال ہوئے ہیں۔ اور چوں کہ حالی نے یہ واقعہ خود سرسید کی زبانی بیان کیا ہے، اس لیے ان کا بیان قابلِ ترجیح ہے۔ البتہ یہ ٹھیک ہو سکتا ہے کہ سرسید نے بھی میرزا کی صفائی کے لیے کوشش کی ہو۔[2]

شاعرِ دربار کی تجویز لارڈ ڈالن برا گورنر جنرل اپنے عہدِ حکومت میں غالب پر خاص مہربانی فرماتے رہے تھے۔ میرزا کو سرکار

---

[1] حیاتِ جاوید۔ ۱۰۶۶ (حاشیہ)

[2] مولانا آزاد کو اس مضمون میں ایک اور بھی سہو ہوا ہے۔ جس قصیدے سے متعلق ان کا یہ مضمون ہے، انھوں نے اس کی تاریخ ۱۸۶۰ء متعین کی ہے۔ یہ قصیدہ ۱۸۶۳ء سے پہلے کا نہیں ہو سکتا۔ کیوں کہ اسی برس ان کے دربار و خلعت پر سے بندش رفع ہوئی تھی۔

انگریزی کی طرف سے خلعت کا اعزاز بھی انہی کے زمانے میں عطا ہوا تھا۔ ان سابقہ عنایتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، میرزا نے ۱۸۵۵ء میں ایک قصیدہ لارڈ الن برا کی خدمت میں ولایت بھیجا کہ وہ لے جناب ملکہ معظمہ کی خدمت میں پیش کر دیں۔ تین ماہ بعد انھیں لارڈ الن برا کی طرف سے اطلاع ملی کہ قصیدہ ملکہ عالیہ کی بارگاہ میں پیش کر دیا گیا ہے لیکن اس کے ایک ماہ بعد مسٹر زر نگٹن سکرٹری کا خط ملا کہ قاعدے کے مطابق آئندہ تمام ایسی چیزیں گورنر جنرلِ حال کے توسط سے بھیجی جایا کریں۔ اس پر انھوں نے دو بارہ ۱۸۵۶ء میں وہی قصیدہ لارڈ کیننگ گورنر جنرل کی وساطت سے بھیج دیا اور یہ درخواست بھی ملکہ معظمہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کی، کہ جیسے روم و ایران کے بادشاہ اور دوسرے ملکوں کے حکمران اپنے مدح خواں شعرا کو بخشش و بخشائش کے مختلف طریقوں سے نوازتے ہیں، ان کے منہ موتیوں سے بھرواتے اور انھیں سونے چاندی میں تلواتے اور انعام عطا کرتے ہیں۔ میری یہ درخواست ہے کہ اس ثنا خوانِ قدیم کو بھی ملکہ عالیہ کے دربار سے ایک خطاب عطا ہو۔ اور میرے موجودہ خلعت اور پنشن میں بھی اضافہ کیا جائے۔ اس درخواست پر اگرچہ انھیں کوئی قطعی امید تو نہیں دلائی گئی تھی لیکن مسٹر رسل کلارک کی طرف سے ۱۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا جو خط انھیں جنوری ۱۸۵۷ء کے آخر میں موصول ہوا، وہ بالکل مایوس کرنے والا بھی نہیں تھا۔ میرزا انھیں امیدوں میں بیٹھے تھے، کہ فساد ہو گیا اور وہ

ہ کلیات نثر صہ ۳۹۳-۳۹۴، احوالِ غالب صہ ۲۸

بساط ہی اُلٹ گئی۔[۱]

فساد کے دوران میں میرزا نے فارسی رسالہ دستنبو لکھا تھا، انھوں نے اس کے چند نسخوں کی جلدیں خاص اہتمام سے تیار کرا کے انھیں ہندوستان اور انگلستان کے بڑے بڑے انگریز افسروں کو بھیجا تھا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے، خواجہ غلام غوث خاں میر منشی کو لکھتے ہیں:[۲]

"اب سُنئے، اودھر کی ۱۸۵۶ء سے بموجب تحریر وزیر عطیۂ شاہی کا امیدوار ہوں۔ تقاضا کرتے ہوئے شرماؤں۔"

یہ خط ۳۰ جنوری ۱۸۵۹ء کو لکھا تھا۔ اس سے اگلے ہی دن ۳۱ جنوری کو انھوں نے خواجہ صاحب موصوف ہی کو ایک اور خط لکھا۔ اس میں خاص اس بات کو ذرا تفصیل سے لکھتے ہیں:[۳]

"۷ دسمبر ۱۸۵۶ء کا لکھا ہوا حکم وزیر اعظم کا ولایت کی ڈاک میں مجھ کو آیا ہے کہ قصیدہ کے صلہ اور جائزہ کے واسطے کہ جو بتوسط لارڈ الن برا[۴] سائل

---

[۱] کلیات نثر (فارسی)، صہ ۳۹۴-۳۹۵، اردوے معلیٰ صہ ۲۱۴ (بنام غلام غوث خاں بیخبر)

[۲] اردوے معلیٰ صہ ۲۰۵

[۳] ایضاً صہ ۲۱۴

[۴] میرے خیال میں یہاں میرزا غلطی سے لارڈ کیننگ کی جگہ لارڈ الن برا لکھ گئے ہیں۔ چونکہ انھوں نے پہلے قصیدہ لارڈ الن برا کے توسط سے بھیجا تھا۔ وہی نام ان کے ذہن میں رہا۔ صحیح لارڈ کیننگ ہوگا۔ اگرچہ یہ بھی ممکن ہے کہ پہلے جو قصیدہ لارڈ الن برا کے ذریعہ بھیجا گیا تھا یہ واقعی اسی کی رسید ہو۔

نے بھجوایا ہے۔ خطاب اور خلعت اور پنشن کی تجویز ضرور ہے۔ جو حکم صادر ہوگا سائل کو بتوسط گورنمنٹ اس کی اطلاع دینی ضرور ہے۔ یہ حکم مورخہ ۷ ار دسمبر ۱۸۵۶ء آخر جنوری ۱۸۵۷ء میں، میں نے پایا۔ فروری، مارچ، اپریل خوشی اور توقع میں گذرے۔ مئی ۱۸۵۷ء میں فلک نے یہ فتنہ اٹھایا۔ اب اس کتاب (دستنبو) اور دو سرے قصیدے (شامل دستنبو) کی جا بجا نذر کرنے کا یہ سبب ہے کہ سائل محکمۂ ولایت کو یاد دہی کرتا ہے اور گورنمنٹ سے تحسین طلب ہے۔"

میرزا کو ان یاد دہانیوں سے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مزید خطاب و خلعت تو درکنار پہلا دربار و خلعت اور پنشن بھی جاری نہ ہوئے۔ اور اگلے تین برس انہیں واگذاشت کرانے کی دوڑ دھوپ میں گذر گئے۔ آخر جب مئی ۱۸۶۰ء میں پنشن اور مارچ ۱۸۶۳ء میں دربار و خلعت جاری ہو گئے۔ تو انہیں پھر اپنا پرانا مطالبہ یاد آیا۔ اس پر انھوں نے ۱۸۶۵ء کے آغاز میں دوبارہ درخواست دی کہ (۱) مجھے ملکۂ عالیہ کا شاعرِ دربار مقرر کیا جائے، (۲) دربار میں پہلے سے اونچی جگہ دی جائے اور (۳) میری کتاب دستنبو حکومت اپنے خرچ پر شائع کرے اس پر گورنر جنرل نے لفٹنٹ گورنر پنجاب سے ان کے بارے میں رپوٹ طلب کی۔ چیف سکرٹری گورنمنٹ پنجاب نے لکھا کہ میرے خیال میں کمشنر دہلی کی یہ سفارش معقول ہے کہ علیا حضرت ملکہ معظمہ کا تو نہیں البتہ انہیں وائسرائے کا درباری شاعر مقرر کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ یہ بھی لازم نہیں کہ عہدہ کے ساتھ کوئی تنخواہ مقرر ہو۔ ہاں، سالانہ خلعت ضرور دیا جائے اور اگر سال

کے دوران میں بھی کسی خاص تقریب پر وہ قصیدہ پیش کریں۔ تو بے شک خلعت دیا جا سکتا ہے۔ اس سے میرزا غالب کی بھی اشک شوئی ہو جائے گی اور علوم شرقیہ کی حوصلہ افزائی بھی، جو اس وقت بہت کم نگاہی کا شکار ہو رہے ہیں۔

اس پر مزید تحقیقات کا حکم ہوا کہ غدر کے دنوں میں ان کے رویہ کی تفتیش کی جائے۔ نیز ان سے دستنبو کا ایک نسخہ طلب کر کے اس پر بھی رائے لکھی جائے۔ جب میرزا سے دستنبو کا نسخہ طلب کیا گیا ہے۔ اس وقت وہ رام پور میں تھے[1]۔

رام پور کا دوسرا سفر

دوسرے سفر رام پور کی تقریب یہ تھی کہ ۲۱ اپریل ۱۸۶۵ء کو نواب محمد یوسف علی خاں نے بعارضۂ سرطان انتقال کیا اور ان کی جگہ ان کے فرزند اکبر نواب کلب علی خاں مسند نشین ہوئے۔ میرزا نواب فردوس مکان کی تعزیت اور نواب حال کی تہنیت کے لئے ۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کی صبح کو دہلی سے روانہ ہوئے[2]۔ ملازموں کے علاوہ اس سفر میں بھی باقر علی خاں اور حسین علی خاں ان کے ساتھ تھے چھ دن کے سفر کے بعد وہ ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۵ء کو جمعرات کے دن رام پور پہنچے "نواب خلد آشیاں نے تعظیم، تواضع، اخلاق کسی بات میں کمی نہیں کی" جو نبیلی کوٹھی اقامت کے لئے عطا ہوئی[3]۔ پہلے صبح و شام دونوں وقت کا پر تکلف کھانا

---

[1] یہ سب حالات غیر مطبوعہ کاغذات پر مبنی ہیں۔

[2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸۱ (بنام حکیم احمد حسین مودودی)

[3] مکاتیب غالب صفحہ ۱۱۷ (دیباچہ)

شاہی مطبخ سے آتا رہا۔ بعد میں سب کی نقدی ہوگئی۔ؔ

دستنبو کا دوسرا ایڈیشن میرزا یہاں نواب کلب علی خاں کی تخت نشینی کے "جشن جمشیدی" سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کہ حکومت پنجاب کی طرف سے انھیں حکم پہنچا کہ اپنی کتاب دستنبو کا ایک نسخہ بغرضِ ملاحظہ چیف سکرٹری کے پاس بھیجیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رام پور میں میرزا کو پہلے ایڈیشن کا جو نسخہ دستیاب ہوا وہ اس قابل نہیں تھا کہ اسے بھیجا جا سکتا۔ چوں کہ حکومت کی طرف سے مطالبہ ہوا تھا اور میرزا کی اس سے بہت سی امیدیں وابستہ تھیں اس لئے انھوں نے پہلے ایڈیشن کا یہ نسخہ صحیح کر کے اسے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی کے مطبع میں دوبارہ طبع کرایا اور اس دوسرے ایڈیشن کا ایک نسخہ حکومت پنجاب کو بھیج دیا۔

درخواست کا فیصلہ حکومت کے میر منشی نے دستنبو کو دیکھ کر رپوٹ کی کہ اس کتاب کی زبان خالص پارسی ہے جو عربی کی آمیزش سے پاک ہے۔ قدرتی طور پر اس میں ایسے لفظ آگئے ہیں جو اب بہت کم استعمال ہوتے ہیں اور عام طور پر رائج نہ ہونے کی وجہ سے نامانوس اور بعید الفہم ہیں۔ اس صورت میں حکومت کا اسے اپنے خرچ پر شائع کرنا کچھ ضروری نہیں۔ اس کے ساتھ ہی غدر کے دوران میں غالب کے رویہ کی بھی

ؔ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۶۴، ۱۶۷۔ خطوط غالب (ا۔ ۲۳۰، ۲۳۱) (بنام حکیم غلام نجف علی خاں۔)

تحقیق ہو رہی تھی۔ اس پر پھر وہی رپوٹ برآمد ہوئی جس میں میرزا سے سکہ منسوب کیا گیا تھا۔ قصہ کوتاہ، ان سب باتوں پر غور کر کے حکومت نے ۶ر جنوری ۱۸۶۶ء کو یہ فیصلہ کیا کہ میرزا کو درباری شاعر بنانا مناسب نہیں۔ البتہ گورنر جنرل کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ اگر لفٹنٹ گورنر پنجاب انہیں خلعت دیں یا دربار میں پہلے سے اونچی جگہ عطا کریں[۱]

رام پور سے واپسی باقر علی خاں اور حسین علی خاں رام پور سے ملازموں کے ساتھ ۲۲ر دسمبر ۱۸۶۵ء کو چلے آئے تھے۔ میرزا خود اس کے چند روز بعد ۲۸ر دسمبر کو روانہ ہوئے[۲]۔ راہ میں ایک افسوس ناک حادثہ پیش آیا۔ بارش کے دن تھے، اور رام گنگا میں سیلاب تھا۔ میرزا خود پالکی میں تھے اور شاگرد پیشہ پیدل یا سواریوں پر۔ دریا پر کشتیوں کا عارضی اور کمزور سا پل تھا۔ جونہی ان کی پالکی دریا کے اِس پار پہنچی، پانی کے ایک زوردار ریلے میں پُل بہہ گیا۔ ملازم تمام اسباب اور زادِ راہ سمیت اُس کنارے پر رہ گئے، اور یہ اکیلے اس کنارے پر۔ گرتے پڑتے مشکل سے مرادآباد کی سرائے میں پہنچے اور ایک کمبل میں رات بسر کر دی۔ بڑھاپا اور کمزوری۔ دسمبر کا جاڑا اور بارش۔ اس پر ناکافی کپڑوں کی مصیبت۔ قدرتاً بیمار ہو گئے۔ اگلی صبح مولوی محمد حسن خاں صدر الصدور مرادآباد کو خبر ملی تو وہ اپنے ہاں

---

[۱] یہ حصہ بھی قلمی تحریروں پر مبنی ہے۔

[۲] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۹۲ (بنام نواب علاؤالدین احمد خاں)، خطوط غالب (۱: ۳۶۹)

اُٹھوالے گئے، اور تیمار داری کی۔ یہیں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ رام پور جاتے ہوئے ان سے ملے۔ شیفتہ نے رام پور پہنچ کر نواب خلد آشیاں سے اس حادثے کا ذکر کیا، تو نواب صاحب نے فوراً ایک خاص آدمی کے ذریعے میرزا صاحب کو خط بھیجا، کہ اگر طبیعت زیادہ خراب ہو اور آپ پوری صحت ہو جانے تک مراد آباد ٹھیرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، تو رام پور تشریف لے آیئے۔ یہاں علاج معالجہ بخوبی کیا جائے گا۔[۱] میرزا اس خط کے پہنچنے سے پہلے ہی مراد آباد سے روانہ ہو چکے تھے۔ دہلی پہنچنے کے بعد انھوں نے ایک خط نواب کلب علی خاں کی خدمت میں لکھا۔ جس میں حادثے کی تفصیلات سے انھیں اطلاع دی ہے۔[۲]

"بعد تسلیم معروض ہے۔ مراد آباد پہنچنا، بعد پالکی کے اُتر آنے کے پُل کا ٹوٹ جانا، گاڑی اسباب، یہاں تک کہ رختِ خواب کا مع آدمیوں کے، اس زمہریر کے میدان میں رہنا، بغیر جاڑے کے کچھ نہ کھانا، خیر جو اُن پر گذری، وہ جانیں، میں مراد آباد کی سرا میں ایک چھوٹی سی حویلی میں ٹھیرا۔ بھوکا پیاسا، کمل اوڑھ کر پڑ رہا۔ یہ شعر اپنا پڑھ پڑھ کر صبح کی ؎

گرمِ فریاد رکھا شکلِ نہالی نے مجھے — تب اماں ہجر میں دی بردِ لیالی نے مجھے

صبح کو خستہ و رنجور اٹھا، صاحبزادہ ممتاز علی خاں بہادر کے بھیجے ہوئے

---

[۱] مکاتیب غالب صفحہ ۱۵۸-۱۵۹ (حاشیہ (۳) متعلقہ صفحہ ۴۹)

[۲] ایضاً صفحہ ۴۸ (مکاتیب)

دو فرشتے آئے، اٹھا کر سعید الدین خاں صاحب کے ہاں لے گئے۔ صاحبزادہ صاحب نے وہ تعظیم و تکریم اور سعید الدین صاحب نے وہ تکریم و تعظیم کی کہ میری ارزش سے زیادہ تھی۔ ناگاہ مولوی محمد حسن خاں بہادر صدر الصدور آئے، اور مجھے اپنے گھر لے گئے۔ پانچ دن وہاں رہا۔ بھائی نواب مصطفیٰ خاں بہادر وہیں مجھ سے آ کر ملے۔ دوسرے دن وہ رہ گرائے دار السرور رامپور ہوئے، اور میں جادہ نورد ستم آباد دہلی ہوا۔ دو شنبہ ۲۰ر شعبان ۱۲۸۲ھ، ۸ر جنوری ۱۸۶۶ء در غم کدہ پر پہنچا۔ حضور کے اقبال کی تائید تھی۔ ورنہ میں اور جیتا دہلی پہنچتا۔"

میرزا کا یہ سفر مالی لحاظ سے بہت ناکام اور مایوس کن رہا۔ جب وہ تاج پوشی کے جشن میں شرکت کے لیے "جوانانہ" گئے ہیں تو انھیں توقع تھی کہ نواب کلب علی خاں بہادر اس مبارک تقریب پر روایتی جود و سخا سے کام لیتے ہوئے دربارِ رام پور کے شاعر کو خاص طور پر نوازیں گے۔ وہ جن پریشانیوں میں گھرے ہوئے تھے ان سے نکلنے کے لیے انھیں ایک خاصی بڑی رقم کی ضرورت تھی اور یہ رام پور کے سوائے اور کسی جگہ سے مل نہیں سکتی تھی۔ وہ رام پور اسی عطیۂ خاص کے لیے گئے تھے۔ ورنہ ان ایام میں ان کی صحت کی جو حالت تھی وہ کسی طرح اس سفر کی تکلیف برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ دیکھیے "تفتہ" کو رام پور سے کیا معنی خیز خط لکھا ہے۔[۵]

---

۵ اردوئے معلیٰ صہ ۱۷۱، خطوط غالب (۱: ۱۰۳)

"میں نثر کی داد اور نظم کا صلہ مانگنے نہیں آیا۔ بھیک مانگنے آیا ہوں۔ روٹی اپنی گرہ سے نہیں کھاتا، سرکار سے ملتی ہے۔ وقتِ رخصت میری قسمت اور منعم کی ہمت۔ نواب صاحب ازروئے صورت، روح مجسم اور باعتبارِ اخلاق آیتِ رحمت ہیں۔ خزانۂ فیض کے تحویلدار ہیں۔ جو شخص روزِ ازل سے جو کچھ لکھوا لایا ہے، اس کے بٹنے میں دیر نہیں لگتی۔ ایک لاکھ کئی ہزار روپیہ سال غلہ کا محصول معاف کر دیا۔ ایک اہلکار پر ساٹھ ہزار کا محاسبہ معاف کیا اور بیس ہزار روپیہ نقد دیا۔ منشی نولکشور صاحب کی عرضی پیش ہوئی، خلاصہ عرضی کا سن لیا۔ واسطے منشی صاحب کے کچھ عطیہ، بتقریبِ شادی صبیہ تجویز ہو رہا ہے۔ مقدار مجھ پر نہیں کھلی۔"

لیکن میرزا کی قسمت یاور نہیں تھی۔ دورِ جام ان تک پہنچتے پہنچتے خم خالی ہو گیا اور انھیں "دُردِ تہِ جام" سے سوا کچھ نہ ملا۔ اگرچہ میرزا کے کسی خط یا تحریر سے معلوم نہیں ہوتا کہ انھیں کیا عطیہ ملا لیکن مولانا عرشی لکھتے ہیں[۱۵] کہ نواب خلد آشیاں نے ان کے رام پور پہنچنے کے بعد انھیں ایک ہزار روپے "بتقریبِ جشنِ تختِ نشینی" عطا فرمائے تھے اور رخصت ہوتے وقت مزید دو سو روپے بطورِ "زادِ راہ" مرحمت فرمائے یعنی کُل بارہ سو روپے۔ بھلا کہیں اُوس سے پیاس بجھتی ہے۔ جیسا خود غالب نے ایک خط میں تفتہ کو لکھا ہے اور کسی چیز میں ہو نہ ہو احتیاج میں ان کا پایہ بہت بلند تھا۔ ان کی ضرورت اور توقع کے

---

۱۵ مکاتیب غالب صفحہ ۱۲۵ (دیباچہ)، و صفحہ ۱۳۷ (دیباچہ)

مقابلے میں یہ بارہ سو بہت کم تھے۔ رام پور سے رخصت ہونے سے دو چار دن پہلے نواب علاؤ الدین احمد خاں کو ایک خط لکھا ہے[1]۔ اس میں ایک نہایت پہلو دار شعر ہے ؎

اوّلِ ما، آخرِ ہر منتہی، در اکرام و عزت
آخرِ ما، جیبِ تمنا تہی، از مال و دولت

دہلی واپس پہنچنے پر کس حسرت سے منشی ہر گوپال تفتہ کو لکھتے ہیں[2]۔

"لو صاحب، کھچڑی کھائی، دن بہلائے، کپڑے پھاٹے، گھر کو آئے۔ ۸۔ جنوری ماہ و سال دو شنبہ کے دن غضبِ الٰہی کی طرح اپنے گھر پر نازل ہوا۔"

جس موقع پر یہ ضرب المثل استعمال ہوتی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

افسوس ہے کہ اس کے بعد جلد ہی ان کے تعلقات نواب کلب علی خاں سے بگڑ گئے۔ اس کی ابتدا اگرچہ میرزا کی طرف سے ہوئی جب انھوں نے ایک خط میں حسبِ عادت ہندوستانی فارسی نویسوں کے خلاف طعنہ زنی کی تھی[3]۔ لیکن اس میں بہت کچھ نواب خلد آشیاں کی "نازک مزاجی" بلکہ "تنک مزاجی" کا بھی دخل تھا۔ انھوں نے اس خط کے بعض الفاظ کے ایسے معنی لئے جو یقیناً میرزا کا مقصود نہیں تھا۔ اس کے بعد میرزا نے ہزار جتن کئے کہ کسی طرح

---

[1] اردوئے معلی صہ ۲۹۲

[2] اردوئے معلی صہ ۸۷، خطوط غالب (ا:۱۰۳)

[3] مکاتیب غالب صہ ۶۰-۶۱ (مکاتیب)

نواب صاحب کا دل ان کی طرف سے صاف ہو جائے لیکن بد قسمتی سے ان کی یہ سب کوششیں ناکام رہیں بلکہ ان سے حالت بد سے بدتر ہوتی گئی۔[1]

آخری ایام غالب ایک مدت سے بیمار چلے آتے تھے۔ سلسلِ بول اور قبض کی شکایت انھیں شروع سے تھی اور ان موذی مرضوں سے وہ ہمیشہ نالاں رہے۔ مئی ۱۸۵۸ء میں ان پر قولنج کا پہلا حملہ ہوا اور اس کے بعد تھوڑے تھوڑے وقفے سے یہ دورے آخر تک ہوا کیے۔ ۱۸۶۱ء میں وہ اتنے کمزور تھے کہ جب نواب محمد یوسف علی خاں نے اپنے منجھلے صاحبزادے حیدر علی خاں کی رسمِ نکاح میں شمولیت کے لیے دعوت دی تو انھوں نے کمزوری اور علالت کا عذر کر کے حاضری سے معافی چاہی اور تہنیت کے دو قطعے لکھ کر بھیج دیے۔[2] ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء کا بیشتر حصہ پھوڑوں اور زخموں کی تکلیف میں بسر ہوا۔ "جتنا خون بدن میں تھا۔ بے مبالغہ آدھا اس میں سے پیپ ہو کر نکل گیا۔ سن کہاں، جواب تولیدِ دمِ صالح ہو۔" اگرچہ وہ اس بیماری سے اچھے ہو گئے۔ مگر صحت اس حد تک بحال نہیں ہوئی تھی، کہ وہ تندرست کہلا سکیں۔ ۱۸۶۳ء ہی میں انھیں پہلے پہل فتق کی شکایت بھی محسوس ہوئی۔ یہ صورت تھی۔ جب رام پور سے واپسی پر یہ حادثۂ جانکاہ پیش آیا۔ اس نے گویا رہی سہی کسر پوری کر دی۔ اس کے بعد انھیں پوری

---

[1] اس سلسلے میں دیکھیے میرا مضمون "میرزا غالب اور دربار رام پور" اردو کراچی جولائی ۱۹۵۲ء)

[2] کلیات غالب۔ قطعات (۳۶) اور (۳۷)

صحت کا ایک دن بھی نصیب نہیں ہوا۔ ۱۲ر مئی ۱۸۶۶ء کو مولوی حبیب اللہ خاں ذکا کو لکھتے ہیں:[1]

"میرے محب، میرے محبوب، تم کو میری خبر بھی ہے۔ آگے ناتوان تھا اب نیم جان ہوں۔ آگے بہرا تھا، اب اندھا ہوا چاہتا ہوں۔ رام پور کے سفر کا رہ آورد ہے، رعشہ و ضعفِ بصر۔ جہاں چار سطریں لکھیں، انگلیاں ٹیڑھی ہو گئیں، حروف سوجھنے سے رہ گئے۔ اکہتر برس جیا، بہت جیا۔ اب زندگی برسوں کی نہیں، مہینوں اور دنوں کی ہے۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اوائل عمر کی بداعتدالیوں اور شراب نوشی نے ان کی تندرستی کی بنیادیں کھوکھلی کر دی تھیں لیکن جب تک قوار مضبوط اور درست رہے، یہ خرابیاں ظاہر نہیں ہونے پائیں۔ جب کہولت کے بعد بڑھاپا شروع ہوا تو یک لخت مصیبتوں نے انھیں آن گھیرا۔ آمدنی کم ہو گئی اور وہ اپنی خوراک اور آسائش کا پہلا سا معیار قائم نہ رکھ سکے۔ اس سے وہ مخفی اثرات اُبھر کر سطح پر آ گئے، اور طرح طرح کی بیماریوں نے انھیں آدبایا۔ اس پر بھی ممکن تھا کہ وہ ابھی اور کچھ دن زندہ رہ جاتے مگر رام پور کے سفر میں جو افتاد پیش آئی، اس نے ان کی موت کو قریب سے قریب تر کر دیا اور اس کے بعد وہ مستقل طور پر صاحبِ فراش ہو گئے۔

۴۔ دسمبر ۱۸۶۶ء کو ایک خط میں لکھتے ہیں:[2]

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۷

[2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۲ (بنام مولوی حبیب اللہ خاں ذکا)

"اس مہینے یعنی رجب کی آٹھویں تاریخ سے بہتّرواں برس شروع ہوا۔ غذا صبح کو سات بادام کا شیرہ، قند کے شربت کے ساتھ۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کا گاڑھا پانی۔ قریب شام کبھی کبھی تین تلے ہوئے کباب۔ چھ گھڑی رات گئے، پانچ روپیہ بھر، شرابِ خانہ ساز اور اسی قدر عرق شیر۔ اعصاب کے ضعف کا یہ حال، کہ اٹھ نہیں سکتا اور اگر دونوں ہاتھ ٹیک کر، چارپایہ بن کر، اٹھتا ہوں تو پنڈلیاں لرزتی ہیں۔ معہذا دن بھر میں دس بارہ بار، اور اسی قدر رات بھر میں، پیشاب کی حاجت ہوتی ہے۔ حاجتی پلنگ کے پاس لگی رہتی ہے، اٹھا اور پیشاب کیا اور پڑ رہا۔ اسبابِ حیات میں سے یہ بات ہے کہ شب کو بدخواب نہیں ہوتا۔ بعد ارادۂ بول بے توقف نیند آجاتی ہے۔ ایک سو ساٹھ روپے کی آمد، تین سو کا خرچ، ہر مہینے میں ایک سو چالیس روپیہ کا گھاٹا۔ کہو، زندگی دشوار ہے یا نہیں۔ مردنِ ناگوار بد بھی ہے۔ مرنا کیوں کر گوارا ہوگا۔"

قریب قریب یہی حالت ان ایام کی مولانا حالی نے بیان کی ہے۔[۵] آخری

---

۵ یادگارِ غالب صفحہ ۸۹

۱۸۶۷ء میں تو ان کی وفات تک کی افواہ پھیل گئی تھی۔ اس پر مولوی حبیب اللہ خاں ذکا نے تاریخ لکھی ؎

گذشت از جہاں، آں جہانِ سخن — کہ می گفتش عرفی و طالب است
خرد گفت سالش ریاضِ جناں — گران تا گران مسکنِ غالب است

(خاش و خاش، صفحہ ۲۰۹)

سال دو میں انھوں نے کہیں باہر جانا آنا بالکل چھوڑ دیا تھا۔ دن رات کے اکثر اوقات پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ اگرچہ کسی حد تک کمزور حالت میں بینائی آخر تک قائم رہی لیکن کانوں سے بالکل بہرے ہو گئے تھے۔ اگر کوئی تکلف کا ملاقاتی آجاتا تو جوں توں کرکے اُٹھ بیٹھتے، ورنہ لیٹے رہتے۔ ثقلِ سماعت کے باعث بات چیت لکھ کر کرتے تھے۔ پہلے کچھ مدت تک خطوں کے جواب لیٹے لیٹے لکھ لیتے تھے، لیکن جب ہاتھوں میں رعشہ ہو گیا اور قلم پکڑنے اور لکھنے سے انگلیوں میں تکلیف ہونے لگی تو اس حالت میں قدرتاً خطوں کا لکھنا بھی ترک ہو گیا۔ اگر کوئی ملنے والا آجاتا تو باہر کے دوستوں کے خطوں کے جواب اس سے لکھوا لیتے تھے۔ خود بولتے جاتے اور وہ لکھتا جاتا۔

غرض کہ وہ صحیح معنوں میں اپنے اس شعر کا مصداق بن گئے تھے ؎

بہار پیشہ جوانے کہ غالبش نامند
کنوں ببیں کہ چہ خوں می چکد ز ہر نفسش

اعتذار کا اعلان

شعر لکھنا اور کلام پر اصلاح دینا حواس کا کام ہے۔ جب انسان کے قواء اپنا معمولی کام بھی نہ کر رہے ہوں تو شعر و شاعری کیسے سوجھ سکتی ہے۔ چناں چہ جب ان کے ہاتھوں میں رعشہ شروع ہو گیا اور بینائی میں بھی فرق آگیا تو انھوں نے فروری ۱۸۶۷ء میں دہلی کے دو اخباروں، اکمل الاخبار اور اشرف الاخبار، میں یہ بیان چھپوایا۔

؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۸۳ (بنام میاں داد خاں سیاح)

کہ جہاں تک ہو سکا میں نے دوستوں کی خدمت کی۔ ان کے خطوں کے جواب دیتا رہا اور اشعار پر اصلاح دینے سے دریغ نہیں کیا لیکن اب میری صحت اتنی گر گئی ہے کہ کسی طرح اس محنت کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس لئے دوست احباب سے درخواست ہے کہ مجھے خطوں کے جواب اور اشعار کی اصلاح سے معاف رکھیں۔ اس کے باوجود کسی نے ان کے عذر کا خیال نہ کیا اور آخر تک وہ دوستوں کے خطوں کے جواب لکھتے یا لکھواتے رہے۔

وفات آخر وہ دن آ گیا جس کی انھیں ایک مدت سے تمنا تھی۔ چوں کہ انھیں یقین ہو گیا تھا کہ اب میں پورے طور پر صحت یاب نہیں ہو سکتا اس لئے اکثر اپنا یہ مصرع پڑھا کرتے۔ ع:

اے مرگِ ناگہاں تجھے کیا انتظار ہے

یہ شعر بھی عموماً وردِ زبان رہتا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے
عزیزو، اب اللہ ہی اللہ ہے

مرض کی شدت کے باعث موت سے چند دن پہلے متواتر غشی کے دورے پڑتے رہے۔ موت سے ایک دن پہلے کچھ افاقہ ہوا تو کھانے کی خواہش کا اظہار فرمایا۔ پھر ملازم سے کہا کہ میرزا جیون بیگ (یعنی میرزا باقر علی خاں کامل کی سب سے بڑی صاحبزادی) کو بلاؤ۔ یہ عموماً انھیں کے پاس کھیلتی رہتی تھیں۔

؎ اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵ (دیباچہ)

کلّو ملازم انھیں بلانے کے لیے محل سرا میں آیا تو یہ آرام کر رہی تھیں۔ ان کی والدہ جناب بگا بیگم نے کہا کہ سو رہی ہے جونہی جاگتی ہے بھیجتی ہوں۔ ملازم نے واپس جا کے یہی کہہ دیا۔ اس پر فرمایا کہ بہت اچھا جب وہ آئے گی، ہم کھانا کھائیں گے۔ اس کے بعد جونہی گاؤ تکیے پر سر رکھا بے ہوش ہو گئے۔ فوراً حکیم محمود خاں اور حکیم احسن اللہ خاں کو اطلاع دی گئی۔ انھوں نے تشخیص کی کہ دماغ پر فالج گرا ہے۔ تمام کوششیں اور علاج کیے گئے مگر بے سود۔ انھیں ہوش نہیں آیا، نہ اس کے بعد انھوں نے کوئی بات ہی کی۔ اسی حالت میں اگلے دن ۱۵۔ فروری ۱۸۶۹ء (مطابق ۲۔ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ) روز دوشنبہ، دوپہر ڈھلے[۱] (بوقت ظہر[۲]) اس باکمال کا انتقال ہو گیا جس نے اگر ایک طرف اس ملک میں علم و ادبِ فارسی کو نقطۂ معراج تک پہنچا دیا تو دوسری طرف اردو نظم و نثر کو تقلید کی زنجیروں سے آزاد کر کے ایک نئے رنگ کی بنیاد ڈالی جس کی پیروی تو بہتوں نے کی مگر کامیابی کسی کو نصیب نہ ہوئی۔ الا ماشاء اللہ۔

جنازے کی نماز دلّی دروازہ کے باہر ہوئی۔ بعض شیعہ حضرات نے کہا کہ مرحوم شیعہ تھے اس لیے ہمیں اپنے مسلک کے مطابق ان کی تجہیز و تکفین کی

۱؎ اکمل الاخبار دہلی، ۱۷۔ فروری ۱۸۶۹ء بحوالہ اردو اپریل ۱۹۳۵ء صفحہ ۲۴۷

(میر مہدی مجروح کا خط)

۲؎ مکاتیب غالب صفحہ ۱۸۹ (حواشی) (شادان کا خط بنام نواب کلب علی خاں بہادر)

اجازت دی جائے، مگر نواب ضیاء الدین احمد خاں اور حکیم محمود خاں نہیں مانے۔ دونوں صاحبوں کا دہلی میں بہت اثر و رسوخ تھا خصوصاً حکیم محمود خاں کا۔ اگرچہ میرزا کی شیعیت اور تفضیلیت کسی سے مخفی نہ تھی، لیکن کوئی ان دونوں کے سامنے دم نہ مار سکا اور تمام رسوم اہلِ تسنن ہی کے طریقے پر ادا ہوئیں۔ قبر سلطان جی میں، چونسٹھ کھمبا کے متصل، خاندانِ لوہارو کے قبرستان میں ہے۔ جہاں اس خاندان کے اور افراد بھی دفن ہیں۔ میرزا حیرت نے لکھا ہے[۱] کہ اس احاطے کی پختہ چار دیواری میرزا غالب کے کسی ہندو شاگرد نے بنوائی تھی۔ میں اس بیان کی کہیں سے تصدیق نہیں کر سکا، نہ ان ہندو شاگرد کا نام ہی معلوم ہوا۔

متعدد حضرات نے مرثیے اور تاریخیں لکھیں۔ ان میں سے حالی اور مجروح اور سالک کے مرثیے زیادہ مشہور ہیں ایک تاریخ جس میں اکثر اصحاب کو توارد ہوا، "آہ غالب بمرد" ہے۔ یہ دراصل خود میرزا کے ایک قطعہ سے ماخوذ ہے۔ انھوں نے ازرہِ تفنن ایک مدت پہلے اپنی تاریخِ وفات کا یہ قطعہ لکھا تھا ؎

من کہ باشم کہ جاوداں باشم | چوں نظیری نماند و طالب مرد
ور بگویند، در کدامیں سال | مرد غالب، بگو کہ "غالب مرد"

لوحِ مزار پر میر مہدی مجروح کا یہ قطعۂ تاریخ کندہ ہے۔

---

[۱] چراغ دہلی صہ ۳۶

یَاحَیُّ یَاقَیُّوْمُ

رشکِ عرفی و فخرِ طالب مرد ـــ اسد اللہ خانِ غالب مرد

کل میں غم و اندوہ میں با خاطرِ محزوں
تھا تربتِ استاد پہ بیٹھا ہوا غمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا "گنجِ معانی ہے تہِ خاک[1]"
۱۲۸۵ھ

اولاد اور خاندان

میرزا کے اپنے سات بچے پیدا ہوئے، لڑکے بھی اور لڑکیاں بھی۔ مگر کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ نہیں جیا[2]۔

نواب الٰہی بخش خاں معروف کی دو صاحبزادیاں تھیں۔ بڑی کا نام بنیادی بیگم تھا اور چھوٹی کا امراؤ بیگم۔ چھوٹی میرزا غالب کے نکاح میں آئیں

---

[1] اکمل الاخبار کی محولہ فوق اشاعت میں میرزا کی وفات سے متعلق میر مہدی مجروح کا جو خط چھپا ہے اس کے آخر میں یہ قطعہ یوں لکھا ہے ؎

کل مرقدِ استاد پہ افراطِ الم میں — ہاتف نے جو بیٹھے ہوئے دیکھا مجھے غمناک
بولا ہے اگر فکر میں تاریخ کی مجروح — کہہ دے نہ یہی "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

ظاہر ہے کہ نظرِ ثانی میں یہ قطعہ اس طرح ہو گیا جیسے اب لوحِ قبر پر موجود ہے۔

[2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۵ (بنام میاں داد خاں سیاح)

اور بڑی نواب غلام حسین[1] خاں مسرور سے منسوب تھیں۔ اس بیوی سے ان کے دو صاحبزادے ہوئے۔ زین العابدین خاں اور حیدر حسین خاں جب میرزا غالب کا اپنا کوئی بچہ زندہ نہ رہا، تو انھوں نے زین العابدین خاں کو متبنیٰ کرلیا۔ زین العابدین خاں نہایت خوش فکر شاعر تھے۔ اپنے نانا نواب الٰہی بخش خاں معروف کے تخلص کی رعایت سے عارف تخلص اختیار کیا۔ ابتدا میں شاہ نصیر سے اصلاح لی اور بعد میں میرزا سے مشورہ کرتے رہے۔ شاہ نصیر کے تلمذ کے زمانے میں ایک دیوان بھی انھی کے رنگ میں مرتب کرلیا گیا تھا، لیکن غالب کی شاگردی کے بعد اسے نظری کردیا اور طرزِ سخن میں میرزا کی پیروی کرنے لگے اور دوسرا دیوان "مطلعِ مہرِ سعادت" مرتب کیا۔ عارف خطِ نسخ کے بھی ماہر تھے اور اس فن میں مشہورِ زمانہ خوشنویس میر جلال الدین کے شاگرد تھے۔ استاد کی توجہ اور اپنی محنت سے ایک سال کے اندر ہی اتنی مشق بہم پہنچالی کہ استاد نے اصلاح دینا چھوڑ دی اور سند لکھ دی۔ انھی خوبیوں کے باعث میرزا کو بہت عزیز تھے۔ مگر افسوس کہ انھیں عارف کی جوانامرگی کا داغ اُٹھانا پڑا۔ اس جوانِ صالح کا جسے وہ "راحتِ روحِ ناتواں" اور "شمعِ دودماں" کہتے تھے۔ عین عالمِ شباب میں نکسیر سے بکثرت خون ضائع ہوجانے

---

[1] نواب غلام حسین خاں بیٹے تھے شرف الدولہ نواب فیض اللہ خاں بہادر سہراب جنگ ابن نواب قاسم جان کے۔ اور قاسم جان بھائی تھے نواب عارف جان کے جن کی اولاد میں نواب احمد بخش خاں اور الٰہی بخش خاں معروف تھے۔

اور اسہال کے مرض سے اپریل ۱۸۵۲ء (جمادی الثانی ۱۲۶۸ھ) میں انتقال ہو گیا۔ انتقال کے وقت عمر صرف ۳۶ برس کی تھی۔

میرزا کو عارف کی موت کا قدرتاً سخت صدمہ ہوا۔ اسی موقع پر انھوں نے وہ مشہور پُر درد نوحہ لکھا جس کا پہلا شعر ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور

میرزا قربان علی بیگ خاں سالک نے تینوں شاعروں کی، جو اسی سال آگے پیچھے فوت ہوئے تھے، ایک ساتھ تاریخ لکھی ؎

برس دن میں مرے یہ تین شاعر — کہ جو تھے حضرتِ دہلی کے ساکن
نہ ہاتھ آئی کوئی تاریخ رحلت — رہی فکر اس کی سالک کو بہت دن
کہا دل نے کہ داخل ہو گئے سب — ارم میں عارف و تسکین و مومن

۱۳۶ + ۵۴۰ + ۳۵۱ + ۲۴۱ = ۱۲۶۸

عارف کی اولاد

عارف نے دو نکاح کیے، پہلا نواب شمس الدین احمد خاں کی سگی ہمشیرہ نواب بیگم سے ہوا۔ نواب بیگم شادی کے دو برس بعد ستوانسا بچہ پیدا ہونے سے زچگی میں فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد عارف کا دوسرا نکاح ایک معزز خاندان کے فرد میرزا احمد علی بیگ بخارائی کی صاحبزادی لبستی بیگم عرف نواب دُلہن سے ہوا۔ نواب دُلہن کے بطن سے ان کے دو لڑکے ہوئے۔ باقر علی خاں اور حسین علی خاں۔ لبستی بیگم کی وفات عارف سے تین چار ماہ پہلے دردِ گردہ سے ہوئی۔ عارف کو بیوی سے بہت

محبت تھی۔ اس کی ناوقت موت کا انھیں بہت قلق ہوا اور دراصل یہی غم ان کے لئے جان لیوا ثابت ہوا۔ نواب دلہن کی وفات پر دونوں بچّے اپنی دادی بنیادی بیگم کے پاس رہنے لگے لیکن جب ۱۸۵۲ء میں عارف کی وفات ہوئی تو میرزا غالب چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو اپنے گھر لے آئے جو اس وقت صرف دو برس کے تھے اور باقر علی خاں بدستور اپنی جدہ ماجدہ بنیادی بیگم کے پاس رہے۔ مگر بنیادی بیگم بھی عارف کی موت کے بعد زیادہ دن زندہ نہیں رہیں اور اس کے بعد باقر علی خاں بھی میرزا کے پاس آ گئے۔

میرزا باقر علی خاں

میرزا باقر علی خاں اپنے والد کی وفات کے وقت پانچ برس کے تھے۔ ان کا نکاح میرزا غالب کی زندگی ہی میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی صاحبزادی جناب معظم زمانی بیگم عرف بگا بیگم سے ہو گیا تھا[1]۔ شادی کے وقت میرزا باقر علی خاں سترہ برس کے تھے اور جناب بگا بیگم بارہ برس کی۔ اولاد میں پانچ صاحبزادیاں ہوئیں۔ فرزند نرینہ کوئی نہیں ہوا۔ سب سے بڑی صاحبزادی نواب بیگم تھیں جو ۹۔ ماہ کی ہو کر فوت ہو گئیں۔ اس کے بعد محمد سلطان بیگم عرف جندو ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں پیدا ہوئیں۔ میرزا غالب انھیں ہمیشہ لڑکے کی طرح پیار کرتے اور میرزا جیون بیگ کہہ کر پکارتے تھے۔ سبد چین میں ان کی ولادت کا قطعۂ تاریخ موجود

---

[1] بگا بیگم نے ۱۰۔ مئی ۱۹۴۵ء کو ۹۳ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ مندل خانہ میرزا بابر قطب صاحب میں آسودۂ خواب ہیں۔

ہے سہ

سروشِ تہنیت زبدۂ مطالب گفت — بہ من ز مقدمِ فرزند میرزا باؔقر

طریقِ تعمیہ ور زیادہ "جانِ غالبؔ" گفت — چو "قصد" شد متعلق بہ گفتنِ تاریخ

۱۹۴ ۱۰۸۷+ ۱۲۸۱ھ

اس قطعہ سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے گویا کسی فرزندِ نرینہ کی تاریخ ہو، لیکن یہ اسی صاحبزادی کی تاریخِ ولادت ہے۔ ان کا نکاح نواب ضیاء الدین احمد خاں کے پوتے یعنی میرزا شہاب الدین احمد خاں کے صاحبزادے میرزا شجاع الدین احمد خاں تاباںؔ مرحوم سے ہوا تھا۔ ان کی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ ان کی وفات طویل علالت کے بعد ۸۹ برس کی عمر میں، ۲۹ مارچ ۱۹۵۴ء کو دہلی میں ہوئی۔ اور اسی شام اپنی خاندانی ہڑواڑ واقعہ سلطان جی میں سپردِ خاک ہوئیں۔ تیسری صاحبزادی جناب فاطمہ سلطان بیگم عرف بِندو تھیں۔ ان کا نکاح نواب علائیؔ مرحوم کے صاحبزادے میرزا بشیر الدین احمد خاں مرحوم سے ہوا تھا۔ ان کی اولاد موجود ہے۔

ان سے چھوٹی ایک اور صاحبزادی رابعہ بیگم تھیں، جو ڈیڑھ برس کی ہو کر فوت ہوئیں۔ سب سے چھوٹی رقیہ سلطان بیگم عرف چھُٹن ہیں۔ ان کا نکاح کرنیل زیڈ احمد (ذو النور علی احمد) صاحب سے ہوا۔ ان کی اولاد بھی موجود ہے اور یہ خود بھی زندہ ہیں۔

میرزا باقر علی خاں اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ فارسی میں باؔقر اور اردو میں کاملؔ تخلص تھا۔ غالبؔ کے شاگرد قربان علی بیگ خاں سالکؔ سے مشورۂ سخن کرتے تھے۔ میرزا ابھی زندہ تھے کہ یہ بیس برس کی عمر میں مہاراجہ الور کے ہاں مصاحبوں میں ملازم ہو کے چلے گئے۔ وہاں سے

ساٹھ روپیہ درماہہ پاتے تھے۔ مگر وفات سے دو تین برس پہلے ملازمت ترک کر کے دہلی چلے آئے اور گھوڑوں کی تجارت کرنے لگے۔ حیدر آباد سے بھی بلاوا آیا تھا۔ مگر افسوس کہ وہاں جانا نصیب نہ ہوا اور موت کا بلاوا آگیا۔ ان کا انتقال یکم جمادی الاول ۱۲۹۳ھ (۲۵ رمئی ۱۸۷۶ء) کو تپ دق سے ہوا۔ وفات کے وقت عمر صرف ۲۸ برس اور چھ ماہ تھی۔

مدفن سلطان جی میں حضرت محبوب الٰہیؒ کی پائینتی قاسم جانیوں کی ہڑوار میں ہے۔ لوحِ قبر پر ان کے چھوٹے بھائی حسین علی خاں شاداںؔ کی کہی ہوئی یہ تاریخ کندہ ہے۔

هُوَ الْغَفُوْرُ

چو زیں غم خانۂ دنیا سفر کرد
سوئے باغِ جناں باقر علی خاں
بسالِ رحلتش تحریر گردید
"بود مینو مکاں باقر علی خاں"
۱۲۹۳ھ

میرزا حسین علی خاں

میرزا حسین علی خاں اپنے بھائی سے تین برس چھوٹے تھے۔ ۱۸۵۰ء میں پیدا ہوئے۔ غالبؔ انھیں بہت عزیز رکھتے اور ان کے ہر طرح کے لاڈ چاؤ برداشت کرتے تھے۔ حسین علی خاں کا نکاح غالبؔ کی زندگی میں نہیں ہوا، البتہ نسبت قرار پا چکی تھی۔ فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں کے ایک چھوٹے بھائی نبی بخش خاں تھے ان کے پوتے

مرزا اکبر علی خاں نے جنرل سرڈیوڈ اختر لونی کی صاحبزادی؎ سے نکاح کر لیا تھا۔ اس نکاح کا نتیجہ ایک لڑکی خورشید بیگم عرف حسن جہاں بیگم تھی جو میرزا حسین علی خاں سے منسوب ہوئی۔ میرزا غالب اپنی زندگی کے آخری ایام میں اس شادی کے انتظام کے لیے نواب کلب علی خاں خلد آشیاں سے مدد مانگ رہے تھے۔ نواب خلد آشیاں نے مدد کا وعدہ فرمایا تھا۔ اسی زمانے میں میرزا کے قرض خواہوں نے انھیں دق کرنا شروع کیا۔ ان کا سہارا لے دے کے ایک دربارِ رام پور ہی تھا۔ انھیں اس میں شرم محسوس ہوئی کہ اپنا قرض ادا کرنے کے لیے بھی مدد مانگوں اور حسین علی خاں کی شادی کے لیے بھی۔ اس لیے انھوں نے درخواست کی، کہ میں فی الحال حسین علی خاں کا نکاح

؎ جنرل اختر لونی نے ایک عورت مبارک بیگم سے شادی (؟) کرلی تھی اسی مبارک بیگم کی بنائی ہوئی وہ مسجد ہے جو دہلی میں حوض قاضی کے پاس بازار سرکی والان میں تھانہ کے متصل موجود ہے۔ یہ پوری سنگ سرخ کی بنی ہے اور اسی لیے لال مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ پیش طاق پر یہ قطعہ سنگ مرمر کی تختی پر کندہ کیا ہوا موجود ہے۔

مبارک بیگم ایں مسجد بنا کرد — کہ باشد برتر از چرخِ مقوس
کم از بیت المقدس نیست شانش — بگو ایں ثانیِ بیت المقدس

اس مسجد کے علاوہ کابلی دروازہ (دہلی) کے باہر تین چار میل کے فاصلے پر مبارک بیگم کا ایک باغ بھی ہے، جو مبارک باغ کے نام سے مشہور ہے۔ بعض لوگ اسے اختر لونی کا باغ بھی کہتے ہیں۔

نہیں کرنا چاہتا۔ مجھے صرف آٹھ سو روپیہ عطا کیا جائے کہ میں قرض سے سبکدوش ہو جاؤں۔ہ مگر افسوس کہ ان کی کوئی آرزو بھی پوری نہ ہوئی۔ ابھی وہ قرض بھی ادا نہیں کر پائے تھے کہ پیامِ اجل آ پہنچا۔

میرزا حسین علی خاں بھی اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ غالباً شروع میں تخلص راقم تھا بعد میں اردو میں شاداں اور فارسی میں خیالی کرنے لگے۔ غالب کی وفات کے بعد وہ بزمرۂ شعراء ملازم ہو کے رامپور چلے گئے۔ وہاں سے پچیس روپیہ ماہانہ وظیفہ مقرر ہو گیا تھا۔ مگر نہ معلوم کیوں ملازمت چھوڑ دہلی چلے آئے۔ بڑے بھائی کی وفات کا انھیں بہت صدمہ ہوا اور اس کے بعد تندرستی خراب رہنے لگی۔ آخر ۷ ستمبر ۱۸۸۰ء (یکم شوال ۱۲۹۶ھ) کو ان سے جا ملے۔ تاریخ ہوئی "شادان فرخ نہاد" وفات کے وقت عمر تیس برس کے قریب تھی۔

بیگم کی وفات

میرزا کی وفات کے بعد جناب امراؤ بیگم پر گویا غم والم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ پنشن جو انگریزی خزانے سے ملتی تھی۔ وہ بند ہو گئی۔ رام پور کا وظیفہ بھی بند ہو گیا۔ بیوگی کا غم جدا۔ گذر اوقات کے تمام ذرائع کا مسدود ہونا اس کے علاوہ اور میرزا مرحوم کے قرضخواہوں کے تقاضوں کی کوفت سب پر مستزاد۔ آخر انھوں نے یکم اگست ۱۸۶۹ء کو نواب خلد آشیاں کی خدمت میں لکھا کہ آٹھ سو روپیہ میرزا صاحب مرحوم کا

ہ مکاتیب غالب صفحہ ۸۳ (مکاتیب)

قرض باقی ہے۔ اس کی ادائی کے لیے مدد فرمائی جائے۔ جب ایک ماہ تک اس درخواست پر کوئی حکم صادر نہ ہوا تو انھوں نے ۲ر ستمبر ۱۸۶۹ء کو دوبارہ لکھا۔ اس پر ۹ر ستمبر کو نواب مرزا خان داغ کو حکم ہوا کہ وہ تحقیق کر کے رپوٹ کریں۔ آخر کار نواب خلد آشیاں نے ۳۰۔ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو حکم دیا کہ امراؤ بیگم کو چھ سو روپے کی ہنڈی بھیج دی جائے۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ جب قرض آٹھ سو روپیہ تھا۔ میرزا غالب بھی اپنی زندگی میں اسی رقم کی درخواست کرتے رہے اور امراؤ بیگم نے بھی یہی رقم طلب کی تھی تو چھ سو کیوں بھیجے گئے۔[1]

امراؤ بیگم نے سرکار انگریزی میں بھی درخواست دی تھی۔ کہ میرزا صاحب مرحوم کی پنشن ان کے متبنّیٰ بیٹے میرزا حسین علی خاں کے نام منتقل کردی جائے۔" ڈپٹی کمشنر دہلی نے رپوٹ خاطر خواہ کی۔ مگر صاحب کمشنر بہادر نے حکم دیا کہ متبنّی کی پنشن نہیں ہو سکتی۔ ہاں زوجہ کے واسطے مبلغ دس روپیہ تجویز ہوں گے ...... بشرط اینکہ وہ کچہری میں حاضر ہوں۔[2]" یہ شرط بیگم صاحبہ نے منظور نہ کی۔ مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ کوشش اس کے بعد بھی جاری رہی۔

جناب معظم زمانی بیگم کا بیان تھا کہ ان کی وفات عین میرزا صاحب مرحوم

---

[1] مکاتیب غالب صہ ۵ تا ۷ (دیباچہ)

[2] ایضاً صہ ۴ تا ۶ (دیباچہ)

کی برسی والے دن (۲، ذی قعدہ ۱۲۸۶ھ مطابق ۴، فروری ۱۸۷۰ء) ہوئی۔ فرمایا: "ہم لوگ برسی کے انتظام میں لگے تھے کہ انھوں نے دس گیارہ بجے دن کو انتقال کیا۔ پنشن کا حکم آچکا تھا۔ مگر لینے کی نوبت نہیں آئی تھی۔"

اللہ بس باقی ہوس۔

رُباعی

بنگر، عزیزاں ہمہ در خاک شدند
در صید گہِ فنا، بفتراک شدند
آخر ہمہ را خاک نشیں باید شد
گیرم، برفعت ہمہ افلاک شدند

سرمدؔ

دوسرا باب

تصنیفات

۱- فارسی

کلیاتِ نثر کلیات نثرِ فارسی میں تین کتابیں ہیں پنج آہنگ، مہر نیم روز اور دستنبو۔ اکٹھی شائع ہونے سے پہلے بھی مختلف اوقات میں ان کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے تھے۔

پنج آہنگ پنج آہنگ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ آہنگِ اول، القاب و آداب اور ان سے متعلقہ مراتب + آہنگِ دوم، مصادر و مصطلحات و لغاتِ فارسی + آہنگِ سوم، اشعارِ مکتوبی منتخب از دیوان غالب + آہنگِ چہارم، خطبِ کتب و تقاریظ و عبارات متفرقہ + آہنگِ پنجم مکاتیب۔

میرزا علی بخش خاں پنج آہنگ کے دیباچہ میں لکھتے ہیں، کہ "میں ۱۸۳۵ء میں نواب شمس الدین احمد خاں کی وفات کے بعد جے پور سے دہلی پہنچا، تو میرزا غالب کا دیوان فارسی موسوم بہ میخانۂ آرزو مکمل ہو چکا تھا۔ اس کی شرکو میں نے میرزا سے پڑھا تو میرے جی میں آئی کہ یہ شر اور ان کی دوسری متفرق فارسی تحریریں ایک جا کر دینا چاہئیں۔ مگر مکروہات سے فرصت نہ ملی حتیٰ کہ حکیم

رضی الدین حسن خاں بہادر نے تحریک کی کہ ان اوراق کو ضرور جمع کر دیا جائے۔ میرے ہم سبق میر محمد حسین خاں صاحب بھی میرا ہاتھ بٹانے پر تیار ہو گئے۔ میں نے خیال کیا کہ اگر یہ جمع ہو جائیں تو میرا لڑکا غلام فخرالدین خاں ان سے مستفید ہو گا۔ لہٰذا میں نے اس کام پر کمرِ ہمّت کس کے باندھ لی۔"

آہنگِ اوّل و دوم و سوم کا زمانۂ تصنیف ۱۸۲۵ء ہے۔ جب اس سال انگریزوں نے بھرت پور کے قلعہ پر چڑھائی کی تو فخرالدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر بھی انگریزوں کی طرف سے شریکِ جنگ تھے۔ اس معرکے میں غالب اور میرزا علی بخش خاں دونوں ان کے ہم رکاب تھے۔ میرزا علی بخش خاں نے غالب سے کہا کہ اگر آپ تمام ایسے کلمات جمع کر دیں جو رسمی خطوں میں "القاب و آداب اور شکر و شکوہ و شادی و غم" کے اظہار کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، تو یہ بہت مفید ہو گا۔ اس پر میرزا نے آہنگ اوّل و دوم تحریر کئے۔ بعد میں آہنگِ سوم لکھا۔ اس میں اپنے دیوان سے انتخاب کر کے وہ اشعار جمع کر دیئے جو خطوط و مکتوبات وغیرہ میں استعمال کئے جا سکتے ہیں۔

یوں تو مختلف حیثیتوں سے پانچوں حصے ہی قابلِ قدر ہیں لیکن آہنگِ پنجم خصوصاً بہت اہم چیز ہے۔ کیوں کہ اس میں میرزا کے وہ فارسی خطوط ہیں، جو انھوں نے غدر سے پہلے اپنے احباب کو لکھے تھے۔ اس سے ان کی زندگی کے اس زمانہ کے حالات معلوم ہوتے ہیں۔ جس کے لئے ہمارے پاس اور کوئی ماخذ نہیں۔

پنج آہنگ دو دفعہ علیحدہ چھپی۔ ایک بار قلعہ کے مطبع سلطانی میں اور دوسری

دفعہ منشی نورالدین کے مطبع دارالسلام دہلی (حوض قاضی) میں[1] مطبع سلطانی والے ایڈیشن پر تاریخ طباعت ۴ اگست ۱۸۴۹ء (۱۳ رمضان ۱۲۶۵ھ) درج ہے۔ یہ حکیم غلام نجف خاں بہادر کی تصحیح و ترتیب اور اہتمام سے شائع ہوا تھا۔ اس میں چھوٹی تقطیع کے ۴۹۲ صفحے ہیں اور اس کی قیمت چار روپے مقرر ہوئی تھی۔ اس کا نسخہ ہارڈنگ لائبریری دہلی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مطبع دارالسلام والا ایڈیشن اپریل ۱۸۵۳ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کا ایک نسخہ رضا لائبریری رام پور میں موجود ہے۔[2]

مگر جیسا کہ میرزا نے خود لکھا ہے یہ مجموعہ نثر مکمل نہیں۔ ان تحریروں کے علاوہ جو غدر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں اور حسین میرزا کے کتب خانوں سے ضائع ہو گئیں، بعض اور چیزیں بھی اِدھر اُدھر منتشر پڑی ہیں، جو اس میں شامل نہیں۔

۲۔ مہر نیم روز میرزا ۴۔ جولائی ۱۸۵۰ء کو خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مقرر ہوئے تھے۔[3] شروع میں ان کا ارادہ تھا اور بہادر شاہ ظفر کا بھی یہی حکم تھا کہ صرف خاندانِ تیمور کی تاریخ یعنی صاحبقران

---

[1] اردوئے معلی صہ ۲۶۹ (بنام منشی شیونرائن)، خطوط غالب (۱= ۳۸۸)

[2] پنج آہنگ میں سے صرف آہنگ پنجم (خطوط) کچھ مدت کے لئے سلطنت آصفیہ دکن کے امتحاناتِ علومِ شرقیہ کے نصاب میں شامل رہا ہے۔ اس لئے طلبا کی سہولت کے لئے صرف یہ حصہ مطبع انوار الاسلام حیدر آباد دکن سے ۱۳۲۸ھ میں شائع ہوا تھا۔

[3] کلیات نثر (غالب)، صہ ۲۷۱، نیز دیکھو اوپر صہ ۹۰ (حاشیہ ۱)

امیر تیمور سے لے کر حکمرانِ عہد تک کے حالات قلم بند کیے جائیں۔[1] چنان چہ انھوں نے امیر تیمور کے حالات سے کتاب کا آغاز کیا اور جنوری ۱۸۵۱ء تک تیمور سے لے کر ظہیر الدین بابر بادشاہ تک کی سرگذشت مکمل کر دی۔[2] اور مارچ ۱۸۵۱ء کے اواخر تک ہمایوں بادشاہ کی جلاوطنی اور واپسی تک کی داستان لکھ لی۔

میرزا ہمایوں تک کے حالات لکھ چکے تھے، کہ بہادر شاہ نے حکم دیا کہ تاریخ دنیا کے آغاز سے لکھی جائے اور آئندہ کے لیے احترام الدولہ حکیم احسن اللہ خاں کو ان کی مدد اور مشورے کے لیے مقرر فرما دیا۔ اب تک میرزا خود ہی کتبِ تاریخ سے واقعات کا انتخاب کرتے اور انھیں فارسی میں لکھتے رہے تھے۔ اس نئے حکم کے بعد انھوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ واقعات کے اقتباس و انتخاب کا کام حکیم صاحب موصوف اپنے ذمے لے لیں اور اردو مسودہ تیار کر کے میرے پاس بھیج دیا کریں، میں اسے فارسی میں منتقل کر دوں گا۔ اس پر حکیم احسن اللہ خاں نے ”ابتدائے آفرینشِ عالم و ظہورِ آدم“ سے لے کر چنگیز خاں تک کے حالات پر مشتمل مضمون مہیا کر دیا۔ اب چوں کہ کتاب کی وہ صورت نہ رہی جو غالب کا مقصود تھا اس لیے انھوں نے اسے دو حصوں میں تقسیم کیا۔ پوری کتاب کا نام پرتوستان رکھا اور فیصلہ کیا کہ پہلے حصے کا نام مہرِ نیم روز

---

[1] کلیاتِ نثرِ غالب، صہ ۲۷۲

[2] نادراتِ غالب صہ ۵ (مکتوبات)

ہو اور اس میں "آغازِ روزگار" سے لے کر ہمایوں بادشاہ کی "جہاں گردی اور جہاں گیری" تک کے حالات اجمال سے لکھے جائیں۔ دوسرے حصے میں جلال الدین اکبر بادشاہ سے لے کر بادشاہِ عصر ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ کے عہد تک کے حالات نسبتاً زیادہ تفصیل سے قلم بند ہوں اور اس دوسرے حصے کا نام ماہِ نیم ماہ تجویز کیا۔[۱]

لیکن کام ہمایوں کے حالات تک پہنچ کر رُک گیا کیوں کہ نہ حکیم احسن اللہ خاں نے اردو مسودہ بھیجا نہ میرزا اسے فارسی میں منتقل کر سکے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۵۲ء تک یہی صورت رہی، جب اس کی نقل ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی خاں بہادر نے بغرض ملاحظہ منگوا بھیجی۔ چنانچہ مارچ ۱۸۵۲ء میں غالب، نواب ارسطو جاہ کو ایک خط میں لکھتے ہیں:[۲]

"فرمان رفتہ است کہ جزوے از تاریخ تاجدارانِ تمر خانیہ، بہ نظرگاہِ آں والائے ولایتِ ولائے مرتضوی فرستم۔ ذرہ پرورا، مہر گسترا، آں سواد جزوے چند بیش نیست۔ بعدِ حمد و نعت و منقبت و مدحِ والیٔ عصر و سببِ تالیفِ کتاب کہ آئینِ نامہ طرازانِ ہنگامہ آراست، از کشور کشایاں تا نصیر الدین سلطان ہمایوں، سخن راندہ ام۔ باقی داستان بہ فرداست۔"

اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ تیمور سے ہمایوں تک کا مضمون مارچ ۱۸۵۲ء

---

[۱] کلیاتِ نثر فارسی صہ ۲۷۲-۲۷۳، اردوئے معلی صہ ۱۰۶ (بنام سرور)

[۲] کلیات نثر غالب، صہ ۲۳۷

میں ختم ہو چکا تھا۔

جب مضمون حکیم احسن اللہ خاں نے بھیجا، تو میرزا نے اس کے شروع میں ایک نئے دیباچے کا اضافہ کیا اور اس مسودے کو فارسی کا جامہ پہنا دیا۔ یہ کام بھی جون ۱۸۵۲ء میں ختم ہو چکا تھا۔[1]

اس کے بعد حکیم احسن اللہ خاں نے آج کل کرتے دس گیارہ مہینے گذار دیے اور کوئی اردو مسودہ ان کے پاس نہیں بھیجا جس سے یہ کام کھٹائی میں پڑا رہا۔ اب کسر صرف اتنی تھی کہ چنگیز خاں سے امیر تیمور تک کے حالات لکھے جائیں تاکہ تاریخ کا پہلا حصہ مکمل ہو جائے۔ بارے خدا خدا کر کے مہرِ نیم روز اگست ۱۸۵۴ء میں ختم ہوئی۔ عید قربان پر جو ستمبر میں ہوئی تھی میرزا نے حضورِ شاہ میں قصیدے کی جگہ تاریخ کا مسودہ نذر گذرانا اور سندِ خوشنودی حاصل کی۔ منشی نبی بخش حقیر کو لکھتے ہیں:[2]

"میں نے اب کے عید کو قصیدہ نہیں لکھا۔ ایک مجلد اس تاریخ کا تمام کردہ نذر کیا۔ اس کا حال سُنیے، کہ وہ صورت جو پہلے تھی وہ نہیں رہی۔ آگے آغاز امیر تیمور کے حال سے تھا۔ اب شروع تحریر آفرینشِ عالم و ظہورِ آدم سے ہے۔ میں نے کتاب کا نام پرتوستان رکھا اور دو مجلد پر منقسم کیا۔ پہلا مجلد ابتدائے عالم سے حضرت نصیر الدین ہمایوں تک۔ اس کا

---

[1] نادرات غالب صفحہ ۳۵ (مکتوبات)

[2] نادرات غالب صفحہ ۶۳ (مکتوبات)

نام مہر نیم روز رکھا۔ دوسرا مجلد جلال الدین اکبر کے حال سے حضرت والیٔ عصر تک۔ اس کا نام ماہ نیم ماہ۔ سو وہ مہر نیم روز تمام ہوا اور نذر حضور کیا۔ اب اگر زیست وفا کرے گی تو ماہ نیم ماہ لکھا جائے گا۔ توقیع خوشنودی مجھ کو مل گیا۔ یعنی شقہ مشتمل تحسین و اظہار عنایت پر۔ اسی کو خلعتِ فاخرہ اور جاگیر تصور کرتا ہوں۔"

اس خط سے اور نادرات غالب کے متعدد دوسرے خطوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ میرزا لکھنے کے ساتھ ہی مہر نیم روز کی ایک نقل منشی نبی بخش حقیر کو بھیجتے رہے تھے۔ بلکہ ایک خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کا پورا مسودہ منشی جواہر سنگھ جوہر کو بھی بھیجا گیا تھا۔ جوہر کو لکھتے ہیں:[1]

"مسودۂ روزنامۂ روداد اورنگ نشینانِ چغتائیہ بدست ہیرا سنگھ رواں داشتہ ایم و ہنوز از رسیدنش نشاں نہ یافتہ ایم۔ اگر رسیدہ است بنویسند، ورنہ از ہیرا سنگھ باز پرس کنند۔" (نوشتہ ۱۱۔ جون ۱۸۵۲ء)

یہ کتاب مکمل ہونے کے تھوڑے دن بعد میرزا فخرو ولی عہدِ ظفر کے حکم سے ۱۲۷۱ھ (۵۵-۱۸۵۴ء) میں اوّل بار فخر المطابع سے شائع ہوئی۔ اس کی قیمت ایک روپیہ مقرر ہوئی تھی۔ پوری کتاب ۱۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے نسخے عام طور پر ملتے ہیں۔ میرے اپنے پاس بھی ہے۔

اگرچہ میرزا نے دوسرے حصے کا نام ماہ نیم ماہ تجویز کر لیا تھا لیکن اس کے

---

[1] کلیات نثر (غالب)، صفحہ ۲۵۰

لکھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کی وجہ غالباً یہی ہوئی کہ حکیم احسن اللہ خاں بہادر سے مضمون نہ پہنچا اور مئی ۱۸۵۷ء میں ہنگامہ ہو گیا جس میں خاندانِ تیمور کا نام و نشان ہی مٹ گیا۔ تاریخ کا کیا ذکر کون لکھتا اور کس کے لئے لکھتا۔

۳۔ دستنبو دستنبو ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب ہنگامے کے دوران میں لکھا گیا۔ اس میں انھوں نے ٹھیٹ پارسی زبان لکھنے کی کوشش کی ہے جس میں عربی کا کوئی لفظ استعمال نہ ہو سوائے ناموں کے کہ انھیں جوں کا توں لکھنے پر وہ مجبور تھے۔ پھر بھی بعض عربی لفظ آ گئے ہیں۔ میرزا جو کچھ لکھتے جاتے تھے ساتھ کے ساتھ اس کی ایک نقل میر مہدی مجروحؔ کو بھی بھیج دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ وہ ابھی اور زیادہ لکھتے۔ مگر منشی امید سنگھ اندور والے ان کی ملاقات کو آئے، اور انھوں نے دستنبو کا مسودہ دیکھ کر اسے چھاپنے کا قصد کیا۔ اس لئے میرزا نے یکم اگست ۱۸۵۸ء تک کے حالات لکھ کر کتاب ختم کر دی۔ میر مہدی کو لکھتے ہیں[۱]۔

"صاحب ہم نے گھبرا کر اس تحریرِ فارسی کو تمام کیا۔ دفتر بند کیا اور یہ لکھ دیا کہ یکم اگست ۱۸۵۸ء تک میں نے پندرہ مہینے کا حال لکھا اور آگے لکھنا موقوف کیا۔ تم کو آگے اس سے لکھا تھا کہ تم اپنے اوراق کا فقرۂ اخیر لکھ بھیجو۔ اب پھر تم کو لکھا جاتا ہے کہ جلد لکھو تاکہ میں اس کے آگے کی عبارت تم کو لکھ کر بھیج دوں۔"

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۴۱، خطوطِ غالب (۱ = ۲۳۸)

میرزا نے کتاب کا مسودہ چھپنے کے لئے ستمبر میں منشی ہرگوپال تفتہ کے پاس آگرہ بھیج دیا۔ وہاں تفتہ کے علاوہ غالب کے دو اور مخلص دوست منشی نبی بخش حقیر اور میرزا حاتم علی مہر بھی تھے۔ مطبع مفید خلائق کے مالک منشی شیونرائن خود میرزا کے شاگرد اور قدر دان تھے۔ ان چاروں حضرات نے دستنبو کی اشاعت کے تمام مراحل کی نگرانی کی۔ پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلائق سے نومبر ۱۸۵۸ء کے پہلے ہفتہ میں چھپ کر بازار میں آیا۔ اس میں صرف پانسو نسخے چھپے تھے اور ۸ر قیمت تھی۔ کتاب کی ضخامت ۸۸ صفحے ہے۔ یہ پورا ایڈیشن پانچ ماہ کی مدت میں ختم ہوگیا۔ زیادہ بکری پنجاب میں ہوئی۔ میرزا منشی شیونرائن کو اپریل ۱۸۵۹ء میں لکھتے ہیں[1]۔

"دیکھو صاحب تم گھبراتے تھے۔ آخر یہ جنس پڑی نہ رہی اور بک گئی"

اس کے بعد دوسرا ایڈیشن ۱۸۶۵ء میں چھپا۔ میرزا ان دنوں رام پور میں تھے۔ انھوں نے درخواست دی تھی کہ حکومت دستنبو کو اپنے خرچ پر شائع کرے۔ اس لئے حکومتِ پنجاب نے ملاحظہ کے لئے ان سے کتاب کا نسخہ طلب کیا[2]۔ میرزا نے پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ صحیح کرکے لٹریری سوسائٹی روہیل کھنڈ بریلی کے مطبع میں چھپنے کو بھیجا۔ بریلی میں خان بہادر قاضی عبدالجمیل جنون میرزا کے شاگرد اور عزیز موجود تھے۔ میرا خیال ہے کہ یہ ایڈیشن انھیں کی نگرانی میں شائع ہوا ہوگا۔ اس ایڈیشن کے خاتمہ کی عبارت ہے:۔

---

[1] اردوئے معلیٰ صہ ۲۷۳، خطوط غالب (۱ = ۳۹۴)

[2] دیکھو اوپر صہ ۱۲۱

للّٰہ الحمد کہ کتاب افادت انتساب بفرہنگ و دانش مرسوم و بہ دستنبو ئی موسوم چکیدۂ قلمِ جادو رقم .... نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ المتخلص بہ غالبؔ عرف میرزا نوشہ[1] مد اللہ ظلال فیوضہ باہتمام منشی پھندن لال صاحب در قالبِ طبع آمد و از نسخۂ صحیحہ مرسلہ مصنف صاحب نقل شد و بتصحیح تمام در ۱۸۶۵ء حسن اختتام یافت۔

تیسرا ایڈیشن بھی اسی مطبع سے ۱۸۷۱ء میں شائع ہوا۔

ان آخری دونوں ایڈیشنوں میں ترتیب بدل گئی ہے۔ پہلے ایڈیشن کے شروع چھ صفحوں میں ملکہ معظمہ کی مدح میں قصیدہ تھا۔ شمار یافت۔ روزگار یافت۔ اور

---

[1] لطیفہ یہ ہے کہ جن دنوں دستنبو کا پہلا ایڈیشن مطبع مفید خلایق آگرہ میں چھپ رہا تھا۔ چھاپہ خانہ کے مالک منشی شیو نرائن نے میرزا کو ایک خط لکھا جس کے لفافے پر پتے میں "میرزا نوشہ صاحب غالبؔ" لکھ دیا اس پر میرزا نے فوراً تفتہ کو لکھا کہ خدا کے لئے کہیں "میرزا نوشہ" کے الفاظ کتاب پر بھی نہ چھپ جائیں۔ اس "نالائق عرف" کو نہ کلکتہ کے اعلیٰ سرکاری حلقوں میں کوئی جانتا ہے، نہ ولایت میں (اردوئے معلیٰ صفحہ ۴۹) لیکن ان کا یہ خیال غلط تھا۔ دونوں جگہ کے حاکم ان کے اس عرف سے خوب واقف تھے۔ بہر حال جیسا کہ اس عبارت سے ظاہر ہے، انھوں نے دوسرے ایڈیشن کے آخر میں اس عرف کی موجودگی میں کوئی قباحت یا اعتراض نہیں دیکھا۔ غالباً اس لئے کہ ساتھ نام اور تخلص بھی موجود ہیں، یا شاید یہ سبب ہو کہ وہ اب اسے حکام بالا کو تحفے کے طور پر نہیں بھیج رہے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت ان سے استصواب کیا ہی نہ گیا ہو۔

اس کے بعد پھر صفحۂ اول ہے دستنبو۔ دوسرے اور تیسرے ایڈیشن میں پہلے دستنبو کی نثر اور آخر میں یہ قصیدہ ہے اور اس کے علاوہ وہ قطعہ بھی "روزگار چراغاں۔ اشتہار چراغاں" جو انھوں نے دہلی کی فتح کی خوشی میں چراغاں کے موقعہ پر اکتوبر ۱۸۵۸ء میں لکھا تھا۔

کلیاتِ نثر کی اشاعت جیسا کہ میرزا نے کلیات نثر میں پنج آہنگ کے خاتمے میں لکھا ہے۔ ۱۲۸۰ھ میں منشی نولکشور صاحب دہلی آئے اور میرزا کی ملاقات کے لئے گئے۔ انھوں نے کلیات نثر چھاپنے کی اجازت چاہی۔ میرزا نے یہ تینوں کتابیں نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں سے لے کر منشی صاحب موصوف کے حوالے کر دیں۔ انھیں وہ اپنے ساتھ لکھنؤ لے گئے۔ جہاں ان کے مشہور مطبع سے یہ کلیات پہلی بار جنوری ۱۸۶۸ء (رمضان ۱۲۸۴ھ) میں شائع ہوا۔

اس کے دو اور ایڈیشن بھی اس مطبع سے بالترتیب ۱۸۷۱ء اور ۱۸۸۴ء میں شائع ہوئے۔ ایک ایڈیشن ۱۸۷۵ء میں اسی مطبع کی کانپور والی شاخ میں بھی چھپا۔

۳۔ قاطعِ بُرہان میرزا جب غدر کے دنوں میں دروازہ بند کر کے بیٹھ گئے، تو ان کے پاس دساتیر اور بُرہانِ قاطع کا ایک ایک نسخہ تھا۔ برہانِ قاطع مولوی محمد حسین تبریزی ثم دکنی کی لکھی ہوئی لغت فارسی کی مشہور کتاب ہے۔ میرزا نے جب فرصت کے اوقات میں اس کی ورق گردانی کی تو دیکھا کہ اس میں بے شمار غلطیاں ہیں۔ وہ کتاب کے

حاشیہ پر اعتراض لکھتے گئے۔[1] اور بعد میں انھیں مرتب کر کے قاطع برہان کے عنوان سے لکھوا لیا۔ اگرچہ کتاب ۱۸۶۰ء میں مکمل ہو چکی تھی، لیکن اس کے چھپنے کے سامان دو سال تک پیدا نہ ہوئے۔ ۱۸۶۲ء میں اس کا پہلا ایڈیشن بھی مطبع نولکشور لکھنؤ سے شائع ہوا۔ اس میں صرف ۹۷ صفحے ہیں۔ اور اس کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ خود میرزا نے اس کے پچاس نسخے خرید کر دوستوں میں تقسیم کیے تھے۔ میرے پاس بھی اس کا ایک نسخہ ہے۔

درفشِ کاویانی

قاطع برہان میں مزید مطالب و اعتراضات کا اضافہ کر کے میرزا نے اسے دوسری بار دسمبر ۱۸۶۵ء میں چھپوایا۔ اور اس کا نام درفشِ کاویانی رکھا۔ قطعاتِ تاریخ اور غلط نامہ سمیت پوری کتاب میں ۱۵۴ صفحے ہیں۔ یہ ایڈیشن اکمل المطابع دہلی میں چھپا تھا۔ اور اس کی چھپائی کے لیے میر غلام بابا خاں رئیس سورت نے انھیں مدد دی تھی۔ پہلے ایک گھڑی بھیجی[2]۔ پھر نقد سو روپے[3]۔ اس ایڈیشن میں صرف تین سو نسخے

---

[1] میرزا نے "برہانِ قاطع" کا یہ نسخہ جو ایامِ غدر میں ان کے مطالعہ میں تھا اور جس کے حاشیہ پر انھوں نے اپنے اعتراضات لکھے تھے بعد میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو دے دیا تھا۔ (اردوئے معلیٰ صفحہ ۳۲۲) یہ اب بھی نواب صاحب لوہارو کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔

[2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۹ (بنام میر غلام بابا خاں) نیز صفحہ ۱۶ (بنام میاں داد خاں سیاح)

[3] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲ (بنام سیاح)

چھپے تھے۔ ان کا ارادہ تھا کہ ان میں سے ڈیڑھ سو میر صاحب موصوف کی نذر کریں۔[۱]
مگر انھوں نے لکھ دیا کہ اتنے نسخے بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ یہ اطلاع ملنے سے پہلے
میرزا انھیں ۳۶ نسخے بھیج چکے تھے۔ اس کے بعد پھر انھوں نے کوئی کتاب
نہیں بھیجی۔[۲] اس کا ایک نسخہ بھی میرے کتب خانے میں ہے۔

۵۔ کلیاتِ نظم فارسی جیسا کہ میرزا علی بخش نے کلیاتِ نثر فارسی کے
دیباچہ میں لکھا ہے۔ میرزا کا فارسی کلام ۱۸۳۵ء
میں میخانۂ آرزو کے نام سے مرتب ہو چکا تھا۔ مگر اس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۵ء
میں شائع ہوا۔ یہ نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تصحیح و ترتیب کے بعد
مطبع دارالسلام دہلی میں چھپا تھا۔ اس میں کل ۵۰۶ صفحے ہیں اور آخر میں تین
صفحے کا تتمہ ہے۔ دو میں غلط نامہ ہے اور تیسرے پر نیر رخشاں کے لکھے ہوئے
تاریخ کے دو قطعے ہیں۔ اس کے خاتمے کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس
میں ۶۶۷۲ شعر ہیں۔

اس ایڈیشن کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ اب تک صرف چار پانچ نسخوں
کا پتہ چلا ہے۔ میرے کتاب خانے میں بھی ایک مکمل نسخہ ہے۔[۳]

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۲۳ (سیاح)

[۲] ایضاً صفحہ ۱۸ (سیاح)

[۳] پہلے ایڈیشن سے متعلق دیکھیے میرا مفصل مضمون "غالب کا فارسی دیوان۔ طبع اول
(۱۸۴۵ء)" بشمول "گنجینۂ غالب" (مرتبہ ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو)

اس کے بعد کا جتنا کلام تھا، وہ نواب ضیاء الدین احمد خاں اور ناظر حسین میرزا کے پاس جمع ہوتا رہا۔ مگر ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں جب ان صاحبوں کے گھر لٹے تو اس میں میرزا کا کلام بھی ضائع ہو گیا۔ ۱۸۶۲ء تک جو کچھ دوبارہ جمع ہو سکا۔ وہ منشی نولکشور نے نواب ضیاء الدین احمد خاں کے صاحبزادے میرزا شہاب الدین احمد خاں ثاقب سے منگوا لیا اور اپنے مطبع میں چھاپنا شروع کر دیا۔ لیکن مصحح کی بیماری اور کاپی نویس کی غیر حاضری کے سبب چھپائی کا کام بہت آہستہ آہستہ ہوتا رہا۔ بہر حال کلیات کا یہ ایڈیشن مئی یا جون ۱۸۶۳ء میں تیار ہو کر مطبع سے باہر آیا۔ جیسا کہ میرزا نے اپنی تقریظ میں تصریح کی ہے، اس میں ۱۰،۴۲۴ شعر ہیں۔ چھپنے سے قبل منشی صاحب موصوف نے میرزا سے اقرار کیا تھا کہ آپ کو کتاب سوا تین روپے جلد کے حساب سے دی جائے گی۔ مگر بعد میں انھوں نے (شاید لاگت کی زیادتی کی وجہ سے) اس کی قیمت پانچ روپیہ کر دی۔ میرزا پانچ بھی ادا کرنے کو تیار تھے مگر منشی نولکشور نے انھیں سوا تین ہی کے نرخ سے دینا منظور کر لیا اور میرزا اور نواب علاؤ الدین احمد خاں دونوں نے دس دس نسخے اسی قیمت پر خریدے۔

میرزا کی زندگی میں کلیات نظم فارسی کے صرف یہی دو ایڈیشن شائع ہوئے۔

۶۔ سبد چین — ۱۲۸۰ھ میں میرزا نے حکیم غلام رضا خاں صاحب کے اصرار پر انھیں مثنوی "ابرِ گہر بار" الگ سے چھاپنے کی اجازت دے دی۔ حالانکہ یہ کلیات میں شامل تھی۔ یہ نسخہ اکمل المطابع سے شائع ہوا

تھا۔ مثنوی کے اس ایڈیشن میں صرف ۴۲ صفحے ہیں۔ اس کا ایک نسخہ میرے پاس ہے اس کے آخر میں دو قصیدے اور دو قطعے جو کلیات کی اشاعت کے بعد لکھے گئے تھے اور چند رُباعیاں بھی جو کلیات میں چھپنے سے رہ گئی تھیں شامل کر دی گئی تھیں۔ بعد میں یہ قصائد و قطعات وغیرہ دوسرے کلام کے ساتھ ملا کر سبد چین کے عنوان سے ربیع الثانی ۱۲۸۴ھ (اگست ۱۸۶۷ء) میں مطبع محمدی سے شائع ہوئے چونکہ یہ مختصر مجموعہ دوبارہ کہیں نہیں چھپا، نہ اسے کلیات ہی کے کسی ایڈیشن میں شامل کیا گیا تھا۔ اس لئے نایاب ہو چکا تھا۔ میں نے اس کا دوسرا ایڈیشن تیار کیا اور یہ اپریل ۱۹۳۸ء میں مکتبہ جامعہ دہلی کی طرف سے جید برقی پریس دہلی میں چھپ کر شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن میں ترتیب کلام کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا تھا۔ اس میں یہ نقص دور کر دیا گیا ہے۔ نیز میرزا کا بہت سا کلام جو ادھر اُدھر منتشر حالت میں پڑا تھا وہ بھی اکٹھا کر کے اس میں شامل کر دیا گیا ہے۔ اس ایڈیشن میں ۸۰۷ شعر ہیں۔

۷۔ سبدِ باغِ دو در اس کا وحید قلمی نسخہ پروفیسر سید وزیر حسن عابدی ایم اے (صدر شعبہ فارسی و عربی، دہلی یونیورسٹی) کے پاس ہے۔ یہ دراصل سبد چین کا بعد کا ایڈیشن ہے جس کے چھپنے کی نوبت نہ آئی۔ کتاب دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ پہلا حصہ شائع شدہ سبد چین (پہلا ایڈیشن) پر مشتمل ہے جس کے آخر میں چند نظموں کا اضافہ ہے۔ دوسرے حصے میں بعض نثریں ہیں، جو کلیات نثر میں نہیں چھپی تھیں۔ اس کتاب کے کوائف سید وزیر حسن نے اپنے ایک مضمون میں یوں بیان فرمائے

پاس ہے۔

"میرے پاس اس مجموعے کا اصل نسخہ ہے جس کی کتابت، طباعت کی غرض سے مصنف (یعنی غالب) کی زندگی میں ۱۲۸۳ھ (۶۷-۱۸۶۶ء) میں شروع ہوئی تھی، اور مصنف کی وفات کے ایک سال چار مہینے بائیس دن بعد، ۷ ربیع الآخر ۱۲۸۷ھ (مطابق ۷ جولائی ۱۸۷۰ء) کو ختم ہوئی۔ مگر اس مجموعے کے طبع ہونے کی نوبت نہیں آئی۔ سبدِ باغِ دودر، غالب کا رکھا ہوا تاریخی نام ہے جس سے آغازِ کتابت کا سال ۱۲۸۳ھ حاصل ہوتا ہے جیسا کہ خاتمے کی عبارت میں درج ہے کاتب نے یہ نسخہ غالب کے شاگرد منشی ہیرا سنگھ کھتری کی فرمائش پر لکھا تھا، یہ منشی ہیرا سنگھ، حوض قاضی کے قریب گندی گلی میں رہتے تھے۔ اس نسخے میں بعض اشارات سے قیاس ہوتا ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غالب کی نظر سے گذرا تھا۔"

۸۔ دعائے صباح

میرزا نے یہ مثنوی اپنے بھانجے میرزا عباس بیگ اکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر لکھنؤ کی فرمائش پر لکھی تھی۔ دراصل یہ منظوم ترجمہ ہے اصل عربی دعا، الصباح کا جو حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے منسوب ہے۔ یہ مثنوی میرزا کی زندگی میں نولکشور پریس لکھنؤ سے شائع ہوئی تھی لیکن مطبوعہ نسخہ کم یاب ہے۔ اس کی طرف سب سے پہلے مولانا امتیاز علی خاں عرشی

ے رسالہ "آج کل"۔ ۱۵۔ فروری ۱۹۴۷ء صہ

ناظم کتب خانہ رام پور نے توجہ دلائی۔ خوش قسمتی سے اس کا ایک قلمی نسخہ ان کے ہاں موجود تھا۔ انھوں نے ایک مختصر تمہید کے ساتھ اسے شائع کر دیا۔[1] اس کے بعد حسنِ اتفاق سے مطبوعہ نسخہ بھی مل گیا، جو غالب کی زندگی میں مطبع نولکشور سے شائع ہوا تھا۔ اس پر سالِ اشاعت درج نہیں۔[2]

اس میں صرف ۲۶ صفحے ہیں۔ ترتیب یہ ہے کہ سب سے پہلے جلی قلم سے عربی دعا کی نثر ہے۔ اس کے نیچے اس کا ترجمہ فارسی نثر میں دیا ہے اور پھر غالب کا فارسی منظوم ترجمہ ہے۔ فارسی نثر غالب کے قلم سے نہیں، انھوں نے اسے صرف نظم کر دیا ہے۔ پہلے ۲۴ صفحوں میں ۱۲۲ شعر دعائے الصباح کے ہیں۔ آخری دو صفحوں میں سات شعر حضرت امام زین العابدینؑ کی ایک دعا کا ترجمہ ہیں، جن سے متعلق روایت ہے کہ دعائے الصباح کے بعد اسے سجدہ میں پڑھنا چاہیے۔

۹۔ متفرقاتِ غالب

جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم اے کے پاس ایک بیاض ہے جس میں غالب کے کچھ فارسی خطوط ہیں، جو انھوں نے اپنے کلکتہ کے بعض احباب کے نام لکھے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ نظمیں بھی ہیں، جو انھوں نے قیامِ کلکتہ کے دوران میں لکھی

---

[1] "میرزا غالب کی ایک غیر معروف فارسی مثنوی"۔ نگار (لکھنؤ) مئی ۱۹۴۱ء

[2] "غالب کی مثنوی دعاء صباح کا مطبوعہ نسخہ" از فضل اللہ فاروقی۔ نوائے ادب (بمبئی)، اپریل ۱۹۵۰ء

تھیں۔ ان میں ایک اردو غزل بھی ہے۔ موصوف نے اس بیاض کو بعض اور اضافوں اور ایک مفید مقدمہ اور متعدد ضمیموں کے ساتھ "متفرقاتِ غالب" کے نام سے شائع کردیا ہے۔ اس میں ۴۹ خط ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بہت سے خط "پنج آہنگ" میں موجود ہیں لیکن وہاں کہیں کہیں سے عبارت چھوٹ گئی ہے یا کچھ لفظی تغیر ہوگیا ہے۔ متفرقات میں یہ سب خط مکمل ہیں۔ مثنوی بادِ مخالف بھی جو غالب نے کلکتہ میں لکھی تھی، جیسے شروع میں لکھی گئی تھی اسی طرح مکمل اس کتاب میں موجود ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیات میں جو مثنوی شامل ہے اس میں کئی جگہ پر لفظی تبدیلی کردی گئی ہے اور بعض اشعار حذف بھی کردیئے گئے ہیں۔ ۱۸۵۳ء میں غالب نے جو مثنوی ظفر کی طرف سے تشیع سے برأت کے لئے لکھی تھی وہ بھی متفرقات میں شامل ہے۔

یہ کتاب پہلی بار ۱۹۴۷ء میں ہندوستان پریس رام پور میں چھپ کر سلسلۂ مطبوعات کتاب خانہ ریاست رام پور میں شائع ہوئی۔

۱۰۔ مآثرِ غالب | شفاء الملک حکیم حبیب الرحمٰن اخون زادہ احسن مرحوم (ڈھاکہ) کے پاس میرزا غالب کے چند فارسی خطوط تھے جو انھوں نے اپنے کلکتہ اور ڈھاکہ کے بعض دوستوں کے نام لکھے تھے۔ یہ خط میرزا کے ایک شاگرد فضل الدین حیدر عرف حیدر جان شائق جہانگیر نگری نے جمع کئے تھے اور حکیم صاحب مرحوم کو انھیں سے ملے تھے۔ قاضی عبدالودود صاحب بیرسٹر (پٹنہ) نے یہ خط حکیم صاحب مرحوم کے کتب خانے سے حاصل کئے۔ ان کے علاوہ انھوں نے میرزا کی بعض ایسی اردو اور فارسی

تحریریں بھی جمع کیں جو اگرچہ اس سے پہلے شائع ہو چکی ہیں لیکن اب بہت مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں۔ انھوں نے مفید حواشی کے ساتھ، ان سب چیزوں کا مجموعہ جو ۶۸ صفحوں پر مشتمل ہے، "آثر غالب" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ یہ پہلی بار علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر (۱۹۴۹ء) کے ساتھ بطور ضمیمہ چھپا تھا۔

یہ فارسی خط تعداد میں ۳۲ ہیں۔ ان میں سے تین خط ایسے ہیں جو "متفرقات غالب" میں بھی شامل ہیں۔

ب۔ اردو

ا۔ دیوانِ اردو میرزا کو اپنی فارسی دانی اور فارسی شاعری پر ناز تھا اور وہ اپنے اردو کلام کو چنداں وقعت نہیں دیتے تھے۔ اسے وہ اپنے لیے باعثِ ننگ اور اپنے خاص رنگ سے الگ چیز سمجھتے اور اپنے "گلستانِ فرہنگ" کا "برگِ ورژم" کہتے رہے۔ مگر اس میں شبہہ نہیں کہ انھوں نے ابتدا اردو ہی سے کی تھی اور آج ان کی شہرت کا ایوان اردو دیوان ہی کی بنیادوں پر قائم ہے۔ اردو دیوان غدر سے پہلے دو بار چھپا تھا۔ جب انھوں نے مولوی فضل حق خیرآبادی اور دوسرے دوستوں کے مشورہ سے اپنا رنگِ سخن بدلا تو اپنے پہلے کلام کا ایک انتخاب بھی کیا۔[۵] یہی انتخاب پہلی بار

۵۔ میرزا نے اپنے اردو اور فارسی دیوانوں کے دو انتخاب خود کیے، (بقیہ اگلے صفحے کے نیچے)

سر سید احمد خاں مرحوم کے بھائی سید محمد خان بہادر کے قائم کردہ "سید المطابع" یا "مطبع سید الاخبار" سے شعبان ۱۲۵۷ھ (اکتوبر ۱۸۴۱ء) میں چھپ کر شائع ہوا یہ نسخہ پندرہ سطری مسطر کے ۱۰۸ صفحوں کو محیط ہے اور اس میں ۱۰۹۵ شعر ہیں۔ اسکے شروع میں غالب کا فارسی دیباچہ اور آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خاں کی تقریظ ہے[1] جو انہوں نے ۱۲۵۴ھ میں لکھی تھی۔ اس میں شعروں کی تعداد ۱۰۷۰ لکھی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ دیوان ۱۲۵۴ھ میں مرتب ہو چکا تھا اور جب تین برس بعد ۱۲۵۷ھ میں شائع ہوا تو اس میں ۲۵ شعروں کا اضافہ کر دیا گیا۔[2]

(پچھلے صفحہ سے آگے) ایک مولوی سراج الدین احمد صاحب کی فرمائش پر گلِ رعنا کے نام سے اس انتخاب کا اکثر حصہ ضائع ہو گیا لیکن کچھ ورق مولانا حسرت موہانی کے پاس تھے (شرح دیوان غالب حسرت موہانی صفحہ ۱۷۶) اس انتخاب کے شروع اور آخر کی فارسی نثریں میرزا کے کلیات نثر میں شامل ہیں۔ دوسرا انہوں نے نواب کلب علی خاں کی فرمائش پر ۱۸۶۶ء میں کیا۔ یہ ریاست رام پور کے کتب خانے میں محفوظ تھا۔ اور مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے "انتخاب غالب" کے نام سے کتاب خانہ ریاست رامپور کی طرف سے شائع کر دیا ہے۔

[1] یہ تقریظ سر سید احمد خاں کی آثار الصنادید میں بھی موجود ہے۔

[2] میرزا نے جس اصل دیوان سے انتخاب کر کے اپنا اردو دیوان تیار کیا تھا اتفاق سے اس کا ایک نسخہ میاں فوجدار خاں بہادر (بھوپال) کے کتاب خانے میں محفوظ تھا۔ جہاں سے یہ "نسخہ حمیدیہ" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔ مولانا عبد الباری آسی الدنی مرحوم نے بھی کچھ کلام میرزا کے نام سے شائع کیا تھا مگر وہ در اصل غالب کا نہیں۔

اس ایڈیشن کے نسخے بہت کم یاب ہیں۔ ایک کرم خوردہ نسخہ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس تھا۔ ایک خان بہادر ابو محمد مرحوم کے صاحبزادے کے پاس ہے۔ ایک نسخہ پبلک لائبریری رام پور میں بھی محفوظ ہے۔[1]

دیوان اردو کا دوسرا ایڈیشن جمادی الاول ۱۲۶۳ھ (مئی ۱۸۴۷ء) میں منشی نورالدین احمد لکھنوی کے مطبع دارالسلام، حوض قاضی دہلی میں چھپا۔ اس کے شروع اور آخر میں بھی میرزا کا اپنا فارسی دیباچہ اور نیرِ رخشاں کی تقریظ ہے۔ اشعار کی تعداد ۱۱۵۹ ہے۔

مئی ۱۸۵۷ء میں غدر سے دو ہی ایک دن پہلے میرزا نے اپنے دیوان اردو کا ایک نسخہ خوش خط لکھوا کر نواب یوسف علی خاں فردوس مکان کی خدمت میں بھیجا۔[2] جب میرزا جنوری ۱۸۶۰ء میں رام پور گئے تو نواب ضیاء الدین احمد خاں نے ان سے کہا کہ رام پور والے نسخے کی ایک نقل لے کر مجھے بھیج دیں۔ کیوں کہ ان کا اپنا نسخہ غدر میں ضائع ہو گیا تھا۔ رام پور ہی میں میرزا کو میرٹھ کے ایک شخص عظیم الدین احمد کا خط ملا کہ میں آپ کا اردو دیوان چھاپنا چاہتا ہوں، مجھے اجازت دی جائے۔ میرزا چوں کہ اس شخص کو جانتے نہیں تھے، اس لئے انھوں نے اس خط کا کوئی جواب نہ دیا۔ مگر واپسی پر جب وہ میرٹھ میں نواب

---

[1] پہلے ایڈیشن سے متعلق تفصیلات کے لئے دیکھئے مضمون "غالب کی شعر گوئی اور ان کے دواوین" (امتیاز علی خاں عرشی) مطبوعہ علی گڑھ میگزین غالب نمبر صفحہ ۱۱۰ تا صفحہ ۱۱۳۔

[2] مکاتیب غالب صفحہ ۲۱-۲۲ (دیباچہ)

محمد مصطفیٰ خاں شیفتہ کے پاس ٹھیرے۔ تو انھوں نے عظیم الدین احمد کی سفارش کی اور کاپیاں دیکھنے کی خدمت اپنے ذمے لی۔ اس پر میرزا نے دہلی پہنچ کر نواب ضیاء الدین احمد خاں سے قلمی دیوان لے کر میرٹھ بھیج دیا۔ تھوڑے دن بعد منشی شیونرائن مالک مطبع مفید خلائق آگرہ نے انھیں لکھا کہ آپ نے گھر کا مطبع چھوڑ کر دیوان میرٹھ کیوں بھیجا ہے، تو انھوں نے اسے بہ اصرار عظیم الدین احمد سے واپس منگوا کر منشی شیونرائن کے پاس آگرے بھیج دیا۔[۱] دیوان ابھی آگرہ میں چھپنا شروع بھی نہیں ہوا تھا کہ معلوم نہیں کیوں، انھوں نے مطبع احمدی واقع شاہدرہ دہلی کے مالک محمد حسین خاں تحسین کو اس کے چھاپنے کی اجازت دے دی۔ مگر یہ ایڈیشن اتنا غلط چھپا کہ میرزا نے خود ایک نسخے کی نظرثانی و تصحیح کر کے مطبع احمدی کے مالک محمد حسین خاں مذکور کو دیا جنھوں نے اسے محمد عبدالرحمٰن خاں مہتمم مطبع نظامی کانپور کے پاس بھیج دیا۔[۲] مطبع احمدی والے نسخہ پر تاریخ ۲۰ محرم ۱۲۷۸ھ (۲۹ جولائی ۱۸۶۱ء) درج ہے اور مطبع نظامی والے میں ذی الحجہ ۱۲۷۸ھ (جون ۱۸۶۲ء)، گویا اس ایک برس میں دیوان کے دو ایڈیشن چھپے۔

مطبع احمدی والے نسخے میں ۸۸ صفحے اور ۱۷۹۶ اشعار ہیں۔ اس کے مقابلے میں مطبع نظامی کانپور کے نسخے میں ۱۰۴ صفحے ہیں۔ اگرچہ شعر وہی ۱۷۹۶ ہیں۔

---

[۱] اردوئے معلیٰ صہ ۲۸۲، خطوط غالب (۱: ۲۰۳)

[۲] دیکھو عبارت خاتمہ نسخہ مطبوعہ مطبع نظامی کانپور

اس دوران میں منشی شیونرائن بھی دیوان کا چھاپہ شروع کر چکے تھے لیکن جب انھیں معلوم ہوا کہ دیوان دہلی اور کانپور دو جگہ سے شائع ہو گیا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے سردست اس کا چھاپا ملتوی کر دیا تھا اور آخر اسے اگلے برس ۱۸۶۳ء میں پورا کر کے شائع کیا۔ وہ غالباً دیوان کے ساتھ میرزا کی تصویر بھی چھاپنا چاہتے تھے چنانچہ غالب نے اپنی قلمی تصویر ان کی نذر کی تھی۔ مگر ان کے شائع کردہ دیوان کے ساتھ تصویر نہیں چھپی ہے۔ اس ایڈیشن میں ۱۷۹۵ شعر ہیں اور ۱۴۶ صفحے۔

غالب کی زندگی میں ان کے علاوہ اور کوئی ایڈیشن شائع نہیں ہوا۔

۲۔ عودِ ہندی

میرزا ایک مدت تک اپنے خطوط فارسی زبان میں لکھتے رہے لیکن ۱۸۴۹ء کے شروع میں، یا ممکن ہے اس سے بھی کچھ پہلے، انھوں نے عام طور پر فارسی میں خط لکھنا ترک کر دیا اور اس کے بعد خاص حالات کے سوائے آخر تک وہ اردو ہی میں لکھا کیے۔

میرزا کے اردو خطوط جمع کرنے کا خیال سب سے پہلے ممتاز علی خاں صاحب میرٹھی کو ہوا۔ انھوں نے مارہرہ کے چودھری عبدالغفور سرور سے کہا کہ آپ وہ خطوط عنایت فرمائیں، جو آپ کے پاس ہیں۔ سرور نے نہ صرف اپنے خط ہی دیے، بلکہ وہ بھی جو صاحبِ عالم اور شاہ عالم صاحبان کے نام آئے تھے۔ ان ۳۱ خطوں پر ایک دیباچہ لکھا، جس میں تاریخ کا قطعہ ہے ؎

انشائے مطبوع بصد مطالب لکھی | یعنی پئے دوستانِ طالب لکھی
موسوم کیا جو مہرِ غالب سے سرور | تاریخ بھی اس کی "مہرِ غالب" لکھی

ھ "ادبی خطوطِ غالب" کے فاضل مؤلف مرزا محمد عسکری مرحوم کو اس (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

اور یہ سارا مجموعہ جناب ممتاز علی خاں صاحب کے حوالے کر دیا بعد میں ممتاز علی خاں صاحب کو خیال آیا کہ اگر کوشش اور تلاش کی جائے تو بعض دیگر حضرات سے بھی خط بہم پہنچ سکتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے "مہر" والے مجموعہ کی اشاعت ملتوی کر دی اور خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کی مدد اور وساطت سے مزید ۱۳۷ خط جمع کیے۔ ان کے علاوہ انھوں نے چند تقریظیں اور شروح بھی حاصل کیں۔ ان سب کا مجموعہ عود ہندی کے نام سے اوّل بار مطبع مجتبائی میرٹھ سے ۱۰ رجب ۱۲۸۵ھ (۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء) کو (یعنی میرزا کی وفات سے تقریباً چار ماہ پہلے) شائع ہوا۔ اگرچہ تمام مسودہ ۱۸۶۶ء میں مکمل ہو کر مطبع میں دیا جا چکا تھا۔[1]

یہ نسخہ ۱۸۸ صفحوں پر چھپا ہے۔ اس کے شروع میں منشی ممتاز علی خاں کا دیباچہ اور آخر میں حکیم غلام مولا صاحب قلق میرٹھی کی تقریظ اور مختلف اصحاب کے چار تاریخی قطعے ہیں۔ میرے پاس اس پہلے ایڈیشن کا نسخہ ہے۔

(پچھلے صفحے سے آگے) تاریخ سے یہ شبہہ ہوا کہ "عود ہندی" سب سے پہلے ۱۸۶۲ء میں شائع ہوئی۔ (صفحہ ۷) حالاں کہ اور تمام قرائن کو چھوڑ کر نامۂ غالب کی اس میں شمولیت ہی ان کے اس خیال کی تردید کرنے کے لیے کافی تھی۔ کیوں کہ یہ خط ۱۸۶۵ء میں لکھا گیا تھا۔ انھیں "اردوے معلی" سے متعلق بھی غلط فہمی ہوئی، جو انھوں نے لکھا ہے کہ یہ کتاب میرزا کی زندگی میں شائع ہو چکی تھی۔ (صفحہ ۹)

[1] اس ایڈیشن کی مفصل کیفیت کے لیے دیکھیں رسالہ "ہندستانی" الہ آباد (اکتوبر ۱۹۳۵ء) مضمون "عود ہندی کی ترتیب" از جناب منشی مہیش پرشاد مرحوم۔

۳۔ اردوئے معلّٰی

عودِ ہندی کی ترتیب ۱۸۶۱ء میں شروع ہوئی تھی۔ مگر خطوں کے جمع کرنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ اس کے چھپنے میں بہت دیر ہو گئی۔ دوستوں کی طرف سے تقاضا شروع ہوا تو میرزا نے خواجہ غلام غوث خاں بیخبر کو لکھا کہ آپ کے پاس جتنے خط ہیں۔ ان کی نقل مجھے بھیج دیں۔ لکھتے ہیں[1]

"اجی حضرت! یہ منشی ممتاز علی خاں کیا کر رہے ہیں۔ رقعے جمع کیے اور نہ چھپوالیے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ جانتا ہوں کہ وہ آپ کو کہاں ملیں گے جو آپ ان سے کہیں۔ مگر یہ تو حضرت کے اختیار میں ہے کہ جتنے میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں وہ سب یا ان سب کی نقل بطریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔ جی یوں چاہتا ہے کہ اس خط کا جواب وہی پارسل ہو۔"

حقیقت یہ ہے کہ جب منشی ممتاز علی خاں کی طرف سے خطوط کی اشاعت میں غیر معمولی دیر ہوئی تو میرزا نے خیال کیا کہ انھوں نے چھاپنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ اس پر منشی جواہر سنگھ جوہر نے اکمل المطابع کے مہتمم میر فخر الدین کے ساتھ مل کر خطوط جمع کرنا شروع کیے کہ انھیں اس مطبع میں چھاپا جائے۔ میرزا نواب علاء الدین احمد خاں کو اپریل یا مئی ۱۸۶۳ء میں لکھتے ہیں[2]

---

[1] عودِ ہندی صہ ۱۲۹

[2] اردوئے معلّٰی صہ ۲۹۴ (بنام نواب علاء الدین احمد خاں)، خطوطِ غالب (۱: ۳۴۹)

"مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسودات اردو کے جمع کرنے اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسودات مانگے ہیں اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کیے ہیں۔ میں مسودہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا، وہاں بھیج دیا۔ یقین ہے کہ خط میرے تمھارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیل ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی اِدھر آنے والا ہو اس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہوگا۔"

اس سے ظاہر ہے کہ میرزا نے آپ بھی دوستوں سے رقعات جمع کر کے مرتب کے پاس بھیجے تھے۔ گویا وہی کام جو پانچ برس پہلے انھوں نے منشی شیونرائن کے کہنے پر نہیں کیا تھا اور یہ کہہ کر ٹال دیا تھا۔[۱]

"اردو کے خطوط جو آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ ایسا ہوگا، جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا۔ ورنہ صرف تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر، کیا ضرور کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھپوانا میرے خلافِ طبع ہے۔"

اب خود سرگرمی سے اس میں حصہ لینے لگے تھے۔ یہ مجموعہ ۶۔ مارچ ۱۸۶۹ء کو اردوئے معلیٰ کے نام سے چھپا۔ مگر افسوس کہ میرزا کو اس کی شکل دیکھنا نصیب نہ ہوئی۔

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۶۸ (بنام شیونرائن) نیز صفحہ ۷۶ (بنام تفتہ)

وہ اس سے انیس دن پہلے فروری میں وفات پا چکے تھے مرزا قربان علی بیگ خاں سالک نے تاریخ کہی۔

کیا کہوں کچھ کہا نہیں جاتا — لب پہ نالوں کا ازدحام ہوا
صدمۂ مرگِ حضرتِ غالبؔ — سببِ رنجِ خاص و عام ہوا
ہے یہی سالِ طبع سالِ وفات — "آج اردو کا سخن تمام ہوا"
۱۲۸۵ھ

یہ اردوئے معلیٰ کا پہلا حصہ تھا اس میں ۴۴ ۴ صفحے ہیں۔ اس کے آخر میں تین صفحہ کا غلط نامہ ہے۔ اسی مطبع سے یہ حصہ دوبارہ یکم رجب ۱۳۰۸ھ (۱۱۔ فروری ۱۸۹۱ء) کو شائع ہوا۔

حصہ دوم ابھی تک نہیں چھپا تھا۔ آخر کار اپریل ۱۸۹۹ء میں مولانا حالی کی فرمائش پر مولوی محمد عبدالاحد نے اپنے مطبع مجتبائی دہلی میں پہلی دفعہ دونوں حصے یکجا چھاپے۔ اس حصے کی ترتیب مولانا حالی مرحوم کے ہاتھوں سرانجام پائی اور انھوں نے اس میں جگہ جگہ ضروری حاشیوں کا اضافہ کیا۔ یہ حصہ ۵۶ صفحوں کو محیط تھا۔ ۱۹۲۲ء میں شیخ مبارک علی تاجر کتب لاہور نے ایک ایڈیشن کریمی پریس لاہور میں چھاپ کر شائع کیا اس میں پہلے دو حصوں کے علاوہ آخر میں ایک ضمیمہ بھی ہے۔ اسے مسٹر شیر محمد سرخوش نے مرتب کیا اور ایک دیباچہ بھی لکھا۔ اس ضمیمے میں ۲۲ خط ہیں۔ لیکن جیسا کہ مولانا عرشی نے بھی لکھا ہے، واقعہ یہ ہے کہ یہ خط سب سے پہلے اردوئے معلیٰ (علی گڑھ)

۵؎ مکاتیب غالب صہ ۲۵۳ (دیباچہ)، نیز دیکھئے خطوط غالب دیباچہ (ک)

کے دسمبر ۱۹۰۷ء کے پرچے میں مولوی علی اصغر بلگرامی نے شائع کیے تھے۔ سرخوش نے وہیں سے نشان دہی کیے بغیر نقل کر لیے ہیں۔

۴۔ مکاتیب غالب میرزا کی دربار رام پور سے بارہ برس خط و کتابت رہی۔ جنوری ۱۸۵۷ء سے مارچ ۱۸۶۹ء تک نواب فردوس مکان کے ساتھ اور اس کے بعد اپنی موت تک نواب خلد آشیاں کے ساتھ۔ خوش قسمتی سے ان میں سے اکثر خطوط ریاست رام پور کے دارالانشاء میں محفوظ تھے۔ مولانا امتیاز علی خاں عرشی ناظم کتاب خانہ رام پور نے انھیں "مکاتیب غالب" کے عنوان سے مرتب کر کے پہلی بار ۱۹۳۷ء میں شائع کیا۔ اس پہلے ایڈیشن میں کل ۱۱۵ خطوط تھے، ۱۰۷ دونوں والیانِ ریاست کے نام اور ۸ رام پور کے بعض اور حضرات کے نام۔ شروع میں مرتب نے ایک مبسوط دیباچہ لکھا۔ جگہ جگہ حاشیہ میں ان خطوط کی نقل دی جو ریاست کی طرف سے میرزا کے خطوں کے جواب میں بھیجے گئے تھے۔ جس سے کتاب اور بھی مفید ہو گئی۔ اس کے بعد اس مجموعے کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور خطوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ مؤلف نے اس میں حواشی بھی بڑھائے اور دیباچے کو بھی مفصل کر دیا۔ یہ پانچویں بار ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا۔ اس میں ۱۳۰ مکتوبات شامل ہیں، ۱۱۷ دونوں نواب صاحبان کے نام اور ۱۳ بعض دوسرے اصحاب رام پور کے نام۔ اس کے بعد چند اور خط بھی دستیاب ہوئے ہیں۔

۵۔ نادرات غالب غالب نے جو خط منشی نبی بخش حقیر اکبر آبادی کے نام لکھے تھے، وہ میر مہدی مجروح اور میرزا افضل علی

عرف میرن صاحب نے جمع کئے تھے۔ خوش قسمتی سے یہ مجموعہ دست بردِ زمانہ سے محفوظ رہ گیا اور میرن صاحب کے نواسے جناب آفاق حسین آفاق دہلوی نے "ادارۂ نادرات کراچی" کی طرف سے شائع کر دیا ہے (۱۹۴۹ء) - اس مجموعے میں ۲۷ خط حقیر کے نام ہیں اور دو ان کے صاحبزادے منشی عبداللطیف کے نام۔ ان میں سے دو خط حقیر کے نام کے اور ایک خط منشی عبداللطیف کے نام کا، اس سے پہلے اردوے معلیٰ میں چھپ چکے ہیں۔

یادگارِ غالب دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا حالی نے یہ کتاب لکھی ہے تو یہ مجموعہ ان کے مدنظر تھا۔

ابھی خطوط کی اچھی خاصی تعداد غیر مطبوعہ ہے[۵]۔ منشی مہیش پرشاد مرحوم کے پاس ایک معقول ذخیرہ تھا۔ انھوں نے غالب کے تمام خطوط کو اہتمام سے مرتب کر کے چھاپنا شروع کیا تھا اور خطوط غالب کی پہلی جلد ۱۹۴۱ء میں

---

[۵] ۱۹۳۹ء میں ایک مختصر مجموعہ "نادر خطوطِ غالب" کے نام سے سید محمد اسمٰعیل رسا گیاوی مرحوم نے شائع کیا تھا، لیکن جیسا کہ میں ثابت کر چکا ہوں، مرتب نے مطبوعہ خطوں کے ٹکڑے اِدھر اُدھر سے جمع کر کے یہ خط تیار کر لئے ہیں ورنہ میرزا نے کبھی یہ ان کے پردادا جناب کرامت ہمدانی مرحوم کے نام نہیں لکھے تھے (دیکھو میرا مضمون "نادر خطوط غالب مرتبہ رسا ہمدانی پر ایک نظر" جامعہ دہلی مارچ ۱۹۴۲ء)۔

ڈاکٹر مختار الدین احمد آرزو کے مرتبہ "گنجینۂ غالب" میں بھی بہت سے نئے خط چھپ گئے ہیں۔

ہندستانی اکیڈیمی الہ آباد کی طرف سے شائع ہوئی تھی۔ اس میں وہ تمام خطوط جو اردوے معلی اور عود ہندی اور مکاتیب غالب میں شائع ہو چکے ہیں یا اور بھی جن تک فاضل مولف کی دسترس ہو سکی شامل کر لئے گئے ہیں۔ اس کی دوسری جلد شائع نہیں ہوئی۔

۶۔ نکاتِ غالب و رقعاتِ غالب جس زمانہ میں میجر فلر پنجاب کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے انھوں نے علومِ شرقیہ کی ترقی کے لئے بہت کوشش کی تھی۔ کئی حضرات کو اپنے پاس لاہور بلوایا اور ان سے کتابیں لکھوائیں۔ جو نہیں آ سکتے تھے ان سے فرمائش کر کے کتابیں تصنیف کرائیں۔ جو لوگ لاہور میں ان کی دعوت پر پہنچے ان میں رائے بہادر ماسٹر پیارے لال آشوب بھی تھے۔ موصوف نے میجر فلر کے حسب الحکم میرزا سے طلبا کے لئے فارسی زبان کی صرف کے قواعد لکھنے کی درخواست کی۔ اس پر میرزا نے دو مختصر رسالے مرتب کئے۔ نکاتِ غالب میں یہ قواعد ہیں جو اردو زبان میں لکھے گئے ہیں اس میں ۲۰ صفحے ہیں۔ رقعاتِ غالب میں ان کے ۱۵ فارسی مکتوبات ہیں۔ جو انھوں نے پنج آہنگ کے آہنگ پنجم سے انتخاب کئے ہیں۔ اس میں صرف ۱۶ صفحے ہیں۔ گویا دونوں چیزیں ۳۶ صفحوں کو محیط ہیں۔ اس کا پہلا ایڈیشن جس میں صرف پانسو نسخے تھے۔ فروری ۱۸۶۷ء میں محمد سعادت علی خاں کے مطبع سراجی دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے بعد دوبارہ یہ رسالہ نہیں چھپا۔

۷۔ قادر نامہ میرزا نے عارف کے دونوں بچوں باقر علی خاں اور حسین علی خاں

کی تعلیم کے لئے ۸ صفحہ کا ایک مختصر منظوم رسالہ قادر نامہ تصنیف کیا تھا۔[1] اس میں خالق باری اور آمد نامہ کے طرز پر اردو اور فارسی ہم معنی لغات ہیں چوں کہ پہلا شعر لفظ قادر سے شروع ہوتا ہے، اس لئے اس کا نام قادر نامہ رکھا گیا ہے۔ شعر اوّل ہے ؎

قادر، اللہ اور یزداں ہے خدا ہے نبی مرسل، پیمبر، رہنما

کل اشعار کی تعداد ۱۳۷ ہے۔ اس میں بارہ شعر دو غزلوں کے شامل ہیں۔ جو قادر نامہ ہی کا حصہ ہیں۔ آخر میں ۴ شعر کا ایک قطعہ ہے۔

قادر نامہ کا پہلا ایڈیشن محبس پریس دہلی سے ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۴ء) میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن چھپے ہیں۔ پہلے ایڈیشن کا ایک نسخہ کتاب خانہ رام پور (رضا لائبریری) میں موجود ہے۔ اس کے آخر میں گیارہ فارسی قطعے ہیں جن کا نام "اسمائے فارسی" رکھا گیا ہے۔ یہ ملا جامی کا کلام ہے۔[2]

۸۔ انتخاب غالب

یہ ۴۸ صفحہ کی مختصر کتاب دو باب پر مشتمل ہے۔ جیسا کہ میرزا نے اس کے دیباچے میں لکھا ہے۔ انہوں نے

---

[1] اردو (۱۹۳۶ء) صفحہ ۷۰۵ (مضمون میرن صاحب از مولانا عبدالحق)

مولانا غلام رسول مہر کو اس رسالے کے غالب کی تصنیف ہونے میں کلام ہے (غالب صفحہ ۳۸۳) لیکن میں اندرونی اور بیرونی شہادتوں کی بنیاد پر ثابت کر چکا ہوں کہ یہ رسالہ غالب ہی کا لکھا ہوا ہے۔ دیکھیے میرا مضمون "قادر نامہ کا مصنف" مطبوعہ اردو۔ جولائی ۱۹۴۷ء)۔

[2] مکاتیب غالب صفحہ ۳۶ (دیباچہ)

اسے فنانشل کمشنر پنجاب میکلوڈ صاحب کی فرمائش پر مرتب کیا تھا۔ پہلے باب میں کچھ نثریں، خطوط، لطیفے وغیرہ ہیں اور دوسرے میں منتخب اشعار۔ یہ کتاب جناب محمد عبدالرزاق نے مرتب کی اور دین محمدی پریس لاہور سے چھپ کر ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ اس کا سارا مضمون، کم و بیش پہلے سے مطبوعہ موجود ہے۔[۱]

ج۔ قاطع برہان کا مباحثہ

محرق قاطع اور اس کے جواب میرزا نے جب ۱۸۶۲ء میں "قاطع برہان" شائع کی تو ہندوستان کے فارسی دانوں کے حلقہ میں گویا ایک بھونچال آگیا۔ بقول غالب "معتقدان برہانِ قاطع، برچھیاں اور تلواریں پکڑ پکڑ کر اٹھ کھڑے ہوئے۔" سب سے پہلے اس کے جواب میں سید سعادت علی کی ~~بھی~~ ہوئی کتاب "محرقِ قاطع برہان" چھپی۔[۲] اس کے جواب

---

[۱] مطبوعہ کتاب ڈاکٹر ضیاء الدین دہلوی کے کتب خانے کے قلمی نسخے کی نقل ہے۔ اس کا ایک اور قلمی نسخہ ڈاکٹر عبدالستار صدیقی (الہ آباد) کے پاس ہے۔ اس کا ذکر رقعات غالب کے نام سے خطوط غالب کے دیباچے (صہ ک) میں آیا ہے اور اس کا دیباچہ اور خاتمہ علی گڑھ میگزین (غالب نمبر) میں بھی چھپ چکے ہیں (صہ ۹۸-۱۰۰)۔

[۲] محرق قاطع برہان، ۹۶ صفحہ کی کتاب فارسی زبان میں ہے۔ یہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۳ء) میں مولوی امو جان کے مطبع احمدی دلہائی شاہدرہ میں چھپی تھی۔ اس کے مصنف سید سعادت علی صاحب پہلے رزیڈنٹ راجپوتانہ کے دفتر میں میر منشی تھے۔ پنشن لینے کے بعد دہلی میں مقیم ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک اور کتاب حدائق العجائب کے مصنف ہیں۔

میں تین رسالے لکھے گئے۔ اول 'دافع ہذیان' فارسی میں۔ اس کے مصنف مولوی نجف علی خاں تھے[۱]۔ دوم 'لطائف غیبی' جس کے مصنف میاں داد خاں سیاح کہے جاتے ہیں[۲]۔ اور سوم سوالات عبدالکریم[۳]۔ یہ دونوں اردو میں ہیں۔

ساطع برہان قاطع برہان کے جواب میں دوسری کتاب "ساطع برہان" لکھی گئی[۴]۔ اس کے مصنف میرزا رحیم بیگ رحیم میرٹھی تھے۔

---

[۱] 'دافع ہذیان' (فارسی) ۴۸ صفحہ کا ایک مختصر رسالہ ہے۔ یہ ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۵ء) میں اکمل المطابع دہلی سے شائع ہوا۔ اس کے مصنف سید محمد نجف علی خاں جھجر کے رہنے والے اور وہاں کے مشہور قاضی خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ان کے والد کا نام سید محمد عظیم الدین تھا۔ مولوی نجف علی خاں عربی اور فارسی کے فاضل تھے۔ نظم و نثر کی متعدد کتابیں ان سے یادگار ہیں۔ ۱۲۹۸ھ میں فوت ہوئے۔ ٹونک کے قبرستان موتی باغ (حصۂ عوام) میں مدفون ہیں۔

[۲] 'لطائف غیبی' (اردو) ۴۳ صفحہ کا رسالہ ہے۔ اس کے مصنف میاں داد خاں سیاح کہے جاتے ہیں۔ مگر یہ میرزا کی اپنی تصنیف ہے۔ اس سے متعلق تفصیل سے آگے لکھا گیا ہے۔ یہ بھی ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۴ء) میں اکمل المطابع دہلی میں چھپا تھا۔ اس کی قیمت ۸ر فی نسخہ تھی۔

[۳] 'سوالات عبدالکریم' (اردو) یہ آٹھ صفحہ کا مختصر رسالہ بھی اکمل المطابع دہلی سے ۱۲۸۱ھ میں چھپا تھا۔ اس میں کل سولہ سوال ہیں اور آخری صفحے پر دو سوالوں کا استفتا ہے۔ میرے خیال میں یہ رسالہ بھی غالب کا لکھا ہوا ہے۔ یا کم از کم اس کی تصنیف میں ان کا بہت زیادہ ہاتھ ہے۔ (اس پر دیکھیے میرا مضمون آجکل۔ فروری ۱۹۵۳ء)

[۴] 'ساطع برہان' (فارسی) ۱۰۴ صفحات کی کتاب ہے۔ یہ ۱۲۸۳ھ میں مطبع ہاشمی میرٹھ سے شائع ہوئی تھی۔

رحیم اچھے فاضل شخص تھے۔ اردو، فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ میرٹھ میں مکتب پڑھاتے تھے۔ آخر عمر میں ان کی بینائی جاتی رہی تھی۔

۹۔ نامۂ غالب (اردو) "ساطع برہان" کے جواب میں میرزا نے خود ۱۶ صفحہ کا ایک خط "نامۂ غالب" کے نام سے لکھا، اور اپنے خرچ پر اس کے تین سو نسخے چھپوا کر دور نزدیک دوستوں میں تقسیم کر دیے[۱]۔ یہ سب سے پہلے ۱۸۶۵ء میں مطبع محمدی (محمد مرزا خاں)، دہلی میں چھپا۔ میرزا نے اس کے ۵ نسخے نواب خلد آشیاں کو رام پور بھیجے اور اس کی اطلاع انھیں ۱۳ اگست ۱۸۶۵ء کے خط میں دی[۲]۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ "نامۂ غالب" اگست ۱۸۶۵ء میں چھپا تھا۔ اس کے بعد یہ خط اسی سال اودھ اخبار کی دو اشاعتوں (۱۰ اکتوبر اور ۱۷ اکتوبر) میں بھی چھپا[۳]۔ اب یہ عودِ ہندی میں شامل ہے۔ پہلے ایڈیشن کا ایک مکمل نسخہ میرے پاس ہے۔

قاطع القاطع و مؤید برہان قاطع برہان کے جواب میں دو کتابیں اور لکھی گئیں۔ ایک قاطع القاطع[۴] جس کے مصنف امین الدین امینؔ دہلوی تھے۔ یہ پٹیالہ میں مدرس تھے۔ در اصل قاطع برہان کے جواب میں سب سے پہلے یہی کتاب لکھی گئی تھی۔ یہ ۱۲۸۱ھ میں مکمل ہوئی۔

---

[۱] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۹-۲۰ (بنام میاں داد خاں سیاح)

[۲] مکاتیب غالب صفحہ ۱۲ (مکاتیب)

[۳] رسالہ ہندستانی (الہ آباد) ۱۹۳۲ء صفحہ ۱۰۶

[۴] قاطع القاطع (فارسی) یہ کتاب ۱۲۸۲ھ مطبع مصطفائی دہلی سے شائع ہوئی تھی اس کے ۱۰۸ صفحے ہیں۔

جیسا کہ اس کی تاریخ ترتیب (فراغ) سے معلوم ہوتا ہے۔ مولف محرق قاطع برہان نے بھی اس کتاب کا ذکر اپنے ہاں کیا ہے (صہ ۴۲) جس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قاطع القاطع اس سے پہلے لکھی جا چکی تھی اور سید سعادت علی نے اس کا مسودہ دیکھا تھا۔ البتہ یہ ۱۲۸۳ھ میں چھپی۔ دوسری کتاب موید برہان[1] تھی اس کے مصنف آغا احمد علی احمد تھے۔ مولوی احمد علی کمپنی کے مدرسہ عالیہ کلکتہ میں فارسی زبان کے مدرس تھے۔ ان کے اجداد اصفہانی الاصل تھے لیکن ایک زمانے سے نقل مکان کر کے ہندستان چلے آئے تھے۔ مولوی احمد علی کا مولد ڈھاکہ (جہانگیر نگر) تھا۔ اس لئے وہ جہانگیر نگری کہلاتے تھے۔ میرزا نے ان کی کتاب دیکھنے سے پہلے ایک قطعہ فارسی[2] زبان میں لکھ کر انھیں بھیجا۔ جس کا پہلا شعر ہے:

مولوی احمد علی احمد تخلص نسخہ
در خصوص گفتگوئے پارسی انشا کردہ است

۱۰۔ تیغ تیز کتاب دیکھنے کے بعد میرزا نے ۳۲ صفحے کا ایک مختصر رسالہ اردو میں لکھا اور اس کا نام تیغ تیز رکھا۔ اس میں سترہ فصلیں ہیں۔ پہلی

---

[1] موید برہان (فارسی) یہ اس سلسلہ کی سب سے مبسوط اور ضخیم کتاب ہے۔ ٹائپ میں مطبع مظہر العجائب کلکتہ میں چھپی تھی۔ ۴۶۰ صفحات کو محیط ہے۔ آخر میں ۷ صفحہ کا غلط نامہ ہے۔ ۱۲۸۲ھ (۱۸۶۶ء) میں شائع ہوئی۔

[2] یہ قطعہ سبد چین میں شامل ہے (صہ ۴۹ تا صہ ۵۱) پہلے یہ الگ بھی اکمل المطابع دہلی میں ۱۲۸۲ھ میں چھپا تھا۔

سولہ فصلوں میں ایک ایک اعتراض مولوی احمد علی صاحب پر کیا ہے اور اسی کے ساتھ ان کے اعتراض کا جواب بھی دیا ہے۔ آخری فصل میں برہان قاطع پر مزید اعتراضات ہیں۔ آخر میں سولہ ادبی سوالات کا استفتا ہے۔ جن کے جواب نواب محمد مصطفےٰ خاں شیفتہ نے دیئے اور مولانا حالی، مولوی محمد سعادت علی خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں تینوں حضرات کی ان جوابات سے متعلق تصدیق و تائید ہے۔ یہ رسالہ اوّل بار مطبع اکمل المطابع سے ۱۸۶۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ نہیں چھپا۔

ہنگامۂ دل آشوب میرزا کے متذکرہ صدر قطعے کے جواب میں مولوی احمد علی نے خود ایک قطعہ لکھا[1] اور اپنے ایک شاگرد مولوی عبدالصمد فدا سلہٹی[2] کے نام سے شائع کر دیا۔ اس کا آغاز یوں ہے ؎

فرقِ حق و باطل اے صاحب نظر بشنو ز من
گر ترا جویائے حق ایزد تعالیٰ کردہ است

اس کے جواب میں میرزا غالب کے دو شاگرد میدان میں اُترے سید محمد باقر علی

---

[1] "ہنگامۂ دل آشوب" میں اس قطعے کا عنوان ہے: "دو میں قطعہ کہ مولوی احمد علی صاحب بجوابِ قطعۂ مرزا غالب نگاشتہ از نامِ عبدالصمد فدا شاگردِ خود شہرت داد۔"

[2] اس قطعے کا نواں شعر ہے ؎

من کیم؟ عبدالصمد، در شعر نامِ من فدا
شہرِ سلہٹ مولدم ایزد تعالیٰ کردہ است

باقرؔ آروی اور خواجہ سید فخر الدین حسین سخنؔ۔ ان دونوں کے قطعے بھی اسی زمین میں ہیں۔ ان چاروں قطعوں کا مجموعہ منشی سنت پرشاد کے مطبع واقعہ آرہ (ضلع شاہ آباد) میں ۵ رذی الحجہ ۱۲۸۳ھ (۱۱راپریل ۱۸۶۷ء) کو چھپا اور "ہنگامۂ دل آشوب" اس کا نام ہوا۔

تیغ تیز تر اس پر عبد الصمد فداؔ (یا دوبارہ مولوی احمد علی صاحب) نے باقرؔ اور سخنؔ کے دونوں قطعوں کا جواب لکھا اور پہلے چاروں کے ساتھ اس پانچویں قطعہ کو ملاکر اس مجموعہ کا نام "تیغ تیز تر" رکھا۔ یہ رسالہ ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں غلام نبی خاں کے مطبع نبوی سے شائع ہوا۔

ہنگامۂ دل آشوب حصہ دوم اس کے بعد منشی جواہر سنگھ جوہرؔ لکھنوی (شاگرد ناطق مکرانی) نے ایک قطعہ لکھا۔ جس سے آغا احمد علی کی حمایت اور میرزا غالبؔ کی مخالفت مقصود تھی۔ اگرچہ ان دونوں باتوں کا اظہار کھلے بندوں نہیں کیا۔ اس پر باقرؔ اور سخنؔ نے جوہرؔ اور فداؔ دونوں کے قطعوں کا ایک ایک جواب لکھا۔ اسی دوران میں میر آغا علی شمسؔ لکھنوی نے اودھ اخبار (۲۵ رجون ۱۸۶۷ء) میں ایک مضمون لکھا جس میں میرزا کے بعض اشعار پر اعتراض کئے تھے۔[۵] اس کا

۵۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کی دو رنڈیوں قمرن جان مشتریؔ (عرف منجھو) اور امراؤ جان زہرہؔ (عرف بی چھٹن) نے بھی اس معرکے میں حصہ لیا تھا۔ یہ دونوں اچھی خاصی تعلیم یافتہ اور مذکور الصدر آغا علی شمسؔ کی شاگرد تھیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے (باقی اگلے صفحہ کے نیچے)

جواب سخن نے اردو نثر میں اور باقر نے فارسی نثر میں لکھا۔ ایک صاحب منشی محمد امیر امیر لکھنوی نے غالب کی حمایت میں اردو قطعہ لکھ کر اودھ اخبار میں چھپوایا۔ ان پانچوں قطعوں اور دونوں نثری مضامین کا مجموعہ منشی سنت پرشاد کے مطبع ہی سے "ہنگامۂ دل آشوب" حصہ دوم کے نام سے ۵ رجمادی الاول ۱۲۸۴ھ (۵ رستمبر ۱۸۶۷ء) کو شائع ہوا۔[۵] منشی محمد امیر صاحب کے قطعہ کے علاوہ جو اردو میں ہے باقی تمام قطعات اُسی ایک زمین میں لکھے گئے تھے۔
انشا کردہ است۔ تقاضا کردہ است۔

شمشیر تیز تر لیکن یہ سب شاعری ہی شاعری تھی۔ میرزا غالب نے جو اعتراض تیغ تیز میں کیے تھے۔ ان کا جواب نہیں ہوا تھا۔ مولوی احمد علی صاحب نے ان اعتراضات کے جواب فارسی نظم و نثر میں لکھے۔ اور اس رسالے کا نام "شمشیر تیز تر" رکھا۔ اس کے آغاز میں "تیغ تیز" کے

(پچھلے صفحے سے آگے) کہ شمس نے خود اعتراض لکھ کر ان دونوں کے نام سے شائع کر دیئے تھے۔ پنڈت کشن لال طالب دہلوی نے ان دونوں سے متعلق بہت سے قطعے لکھے تھے۔ ان میں ایک شعر تھا ؎

شارعِ شمس، زہرہ، مشتری ہے
بڑی تو خیر ہے چھوٹی کھری ہے

(خم خانۂ جاوید جلد پنجم صفحہ ۳۶ تحت شمس)

۵ ہنگامۂ دل آشوب کے دونوں حصے مکمل رسالہ اردو کی اشاعت جنوری ۱۹۳۷ء میں چھپ گئے ہیں۔

پانچوں قطعے بھی شامل ہیں۔ اور اس کے بعد نثر ہے۔ پورا رسالہ ۱۲۲۔ صفحوں پر مشتمل ہے۔ یہ مطبع نبوی (مولوی غلام نبی خاں) میں ۱۸۶۸ء میں چھپا تھا۔ یہ اس سلسلے کی آخری تحریر ہے۔ اس کے جلد بعد ہی میرزا کا انتقال ہو گیا۔ ورنہ ممکن ہے کہ یہ بحث چندے اور جاری رہتی۔ بہر حال جو ہنگامہ قاطع برہان کی اشاعت سے ۱۸۶۲ء میں شروع ہوا تھا وہ شمشیر تیز تر کے ساتھ ۱۸۶۸ء میں ختم ہوا۔

مقدمہ ازالۂ حیثیت عرفی

قاطع برہان کے مخالفوں نے جتنی کتابیں لکھی تھیں ان میں صرف قاطع القاطع کا جواب نہیں لکھا گیا تھا۔ یہ کتاب ایسی فحش اور پوچ زبان میں ہے کہ میرزا کا ارادہ نہیں تھا کہ اس پر توجہ بھی کریں۔ چنانچہ کسی نے ان سے پوچھا کہ حضرت آپ نے اس کا جواب نہیں لکھا تو کہا کہ اگر کوئی گدھا تمھارے لات مارے تو کیا تم بھی اس کے لات ماروگے۔[1] لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں یہ ارادہ بدل گیا اور انھوں نے ۲۔ دسمبر ۱۸۶۷ء کو ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا۔[2] سب سے پہلے انھوں نے دہلی کے ڈپٹی کمشنر اور براؤن صاحب کی خدمت میں درخواست

---

[1] یادگارِ غالب صفحہ ۴۴ "سوالات عبدالکریم" میں یہی لطیفہ "محرق قاطع برہان" سے متعلق بیان ہوا ہے۔ (صعک)

[2] اس مقدمے کی پوری روداد پہلے اردو۔ اپریل ۱۹۴۳ء میں چھپی اور وہاں سے احوالِ غالب میں نقل ہوئی۔ (صفحہ ۱۳۹ تا صفحہ ۱۷۱)

دی کہ میں خاندانی رئیس اور سرکار انگریزی کا منصب دار ہوں۔ مجھے دربار اور خلعت کے اعزاز حاصل ہیں۔ امین الدین دہلوی نے جو پٹیالہ میں ریاست کے مدرسے میں معلم ہے، ایک کتاب قاطع القاطع میں میرے متعلق ایسے ناشائستہ الفاظ لکھے ہیں اور ایسی گالیاں دی ہیں جن سے میری ہتکِ عزت ہوتی ہے۔ مہربانی فرما کر اس امر کی تحقیق کی جائے اور جُرم ثابت ہونے پر مدعا علیہ کو سزائے سخت ملے تاکہ پھر کوئی چھوٹا آدمی، بڑے آدمی کو ایسے کلمات فحش و نامنرانہ لکھے۔"

ڈپٹی کمشنر نے یہ درخواست اسسٹنٹ کمشنر سٹاک ڈن کے پاس بھیج دی جو فوجداری مقدموں کی سماعت کرتا تھا۔ میرزا نے اپنی طرف سے منشی عزیز الدین وکیل سرشتہ کو مقدمے کی پیروی کے لئے مختار مقرر کیا۔ وکیل نے قاطع القاطع کی وہ ایسی عبارتیں پیش کیں۔ جو بنائے دعویٰ تھیں تھوڑے دن بعد سٹاک ڈن صاحب تبدیل ہو گئے اور اب مقدمہ ڈپٹی کمشنر مذکور کی عدالت میں پیش ہوا۔ اوبرائن صاحب نے مولوی امین الدین کے نام سمن جاری کئے اور مدعی اور مدعا علیہ دونوں کو گواہ پیش کرنے کا حکم دیا۔ میرزا نے مندرجہ ذیل اصحاب کے نام داخل کئے:۔

۱۔ مولوی سعادت علی خاں۔ مدرس دہلی کالج۔ دہلی

۲۔ ماسٹر پیارے لال۔ سکریٹری لٹریری سوسائٹی۔ دہلی۔

۳۔ لطیف حسین۔ مدرس اوّل کالجیٹ اسکول۔ دہلی۔

۴۔ نصیر الدین۔ مدرس فارسی و ریاضیات نارمل اسکول۔ دہلی

۵۔ حکیم چند۔ مضمون نگار

ان میں سے کوئی صاحب بھی ۳۶ برس سے زیادہ عمر کے نہیں تھے ان کے مقابلے میں مولوی امین الدین نے مندرجہ ذیل فہرست داخل کی :۔

۱۔ مولوی ضیاء الدین۔ اسسٹنٹ پروفیسر عربی کالج دہلی

۲۔ مولوی سدید الدین۔ سابق پروفیسر عربی کالج دہلی

۳۔ حکیم حشمت اللہ خاں۔

۴۔ سید حمید اللہ

۵۔ مولوی ابراہیم

۶۔ مولوی محمد حسین

۷۔ مولوی قمرالدین

مدعا علیہ کے گواہوں میں پہلے دونوں صاحب سن رسیدہ اور مشہور اور علمی دنیا میں معروف بزرگ تھے۔ ان کے مقابلے میں میرزا کے گواہوں میں کوئی شخص ان کے پائے کا نہیں تھا۔

حالانکہ جو عبارتیں میرزا کی طرف سے پیش کی گئی تھیں، ان سے متعلق کسی قسم کا شبہہ نہیں تھا لیکن مدعا علیہ کے گواہوں نے اسے بچانے کے لیے ان کی طرح طرح کی تاویلیں کیں اور ان لفظوں کے ایسے ایسے دوراز کار معنی بیان کیے کہ حیرت ہوتی ہے کہ عدالت نے انھیں کیسے تسلیم کر لیا۔ لیکن وہ بیچارہ انگریز اور معنی بیان کرنے والے مستند اور مشہور عالم۔ اسے کیا معلوم کہ جیلوں میں یہ مولوی شیطان کے بھی استاد ہیں۔ غرض میرزا کو یقین ہو گیا کہ اس عدالت سے

انصاف کی امید، بے سود ہے۔ ادھر "چند گرامی روٴسا شہر" نے میرزا پر دباؤ ڈالا آخر ان کے بیچ بچاؤ سے میرزا نے مقدمے سے دست بردار ہونا منظور کر لیا اور ۲۳۔ مارچ ۱۸۶۸ء کو راضی نامہ داخل کر دیا۔

مولانا حالیؔ لکھتے ہیں[1]۔

"ان مولویوں کا (جو مولوی امین الدین کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوئے تھے) میرزا سے ملنا جلنا تھا۔ کسی نے پوچھا، حضرت! انھوں نے آپ کے برخلاف شہادت کیوں دی۔ میرزا نے اپنا فارسی کا یہ شعر پڑھا ؎

ہر آنکہ در نگری جز بجنس مایل نیست
عیار بے کسیِ من شرافت نسبی ست

۷۔ لطائفِ غیبی کا مصنف

۱۱۔ لطائفِ غیبی یہ کتاب ۱۸۶۵ء میں سید سعادت علی کی "محرقِ قاطعِ برہان" کے جواب میں لکھی گئی تھی۔ اس پر مصنف کا نام میاں داد خاں سیاحؔ لکھا ہے۔ مگر یہ محض مغالطہ ہے۔ اصل میں یہ کتاب غالبؔ کی اپنی تصنیف ہے۔ اس کے لئے کئی داخلی اور خارجی دلائل ہیں۔

(۱) میرزا ایک خط میں میاں داد خاں سیاحؔ کو لکھتے ہیں[2]:۔

---

[1] یادگارِ غالب (حالیؔ)، صفحہ ۴۷

[2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۳

"تمھیں جو میں نے سیف الحق خطاب دیا ہے۔ اپنی فوج کا سپہ سالار مقرر کیا ہے۔ تم میرے ہاتھ ہو۔ تم میرے بازو ہو۔ میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی۔ لطائفِ غیبی نے اعدا کی دھجیاں اُڑا دیں۔"

اس خط میں دراصل اشارہ ہے خود لطائفِ غیبی کی طرف، جسے میرزا اس سے پہلے شائع کر چکے تھے۔ اس کتاب کے آغاز ہی میں یہ عبارت ہے:۔

"سیاحِ بحر و بر، ہیچمدان، بے ہنر، سیف الحق، میاں داد خاں حق شناسوں کی خدمت میں عرض کرتا ہے۔"

اگر کتاب خود سیاح کی لکھی ہوتی تو وہ دیباچہ میں سیف الحق کیسے لکھتے جب کہ غالب نے یہ خطاب انھیں بعد میں دیا تھا۔ فی الحقیقت غالب نے کتاب لکھ کر ان سے منسوب کی اور پھر گویا انھیں اطلاع دیتے ہوئے یہ لکھا کہ میں نے سیف الحق تمھیں خطاب دیا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے۔ میرزا کے خط کے اس اقتباس سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ کلام میرا ہوگا۔ مگر وہ تمھارے ہاتھ سے لکھا اور شائع کیا جائے گا یعنی میں اپنی تحریر اپنے نام سے شائع نہیں کروں گا۔ (میرے نطق کی تلوار تمھارے ہاتھ سے چلتی رہے گی)

(۲) جن دنوں لطائفِ غیبی چھپی ہے۔ اسی زمانے میں میرزا نے ایک اعتراض قتیل کے کلام پر لکھا اور اخبار میں سیاح کے نام سے چھپوا دیا۔ اس سے بھی اس بیان کی توثیق ہوتی ہے کہ "میرے نطق کی تلوار تمھارے

ہاتھ سے چلتی رہے گی۔" میرزا لکھتے ہیں[1]

"محمد مرزا خاں میرے سببی بھائی کا نواسہ ہے۔ اس نے ایک اخبار نکالا ہے۔ مسمی بہ "اشرف الاخبار" اس کا ایک لفافہ تم کو بھیجتا ہوں۔ اس کو پڑھ کر معلوم کر لو گے کہ تمھارا ایک اعتراض قتیل کے کلام پر چھاپا گیا ہے۔ اس ارسال و اعلام سے صرف اطلاع منظور ہے۔"

لطیفہ یہ ہوا کہ کسی مولوی صاحب نے اس اعتراض کا جواب دیا تو میرزا کو "اکمل الاخبار" میں جواب الجواب چھپوانا پڑا۔ سیاح کو لکھتے ہیں[2]

"واقعی اعتراض کے جواب ایک مولوی نے لکھے ہیں۔ اس ہفتے کے "اکمل الاخبار" میں دیکھ لو۔ جو تم سے کلام کرے۔ اسی انداز سے تم بھی کلام کرو۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جواب الجواب، سیاح کے نام سے نہیں چھپا تھا۔

(۳) لطائف غیبی میں کتابت کی بہت غلطیاں رہ گئی تھیں۔ اگر یہ تصنیف خود سیاح کی تھی۔ تو جو نسخے سیاح کو بھیجے گئے تھے۔ وہ انھیں آپ درست کر لیتے۔ غالب یا کسی اور شخص کو انھیں اغلاط بتانے کی ضرورت جبھی پیش آ سکتی تھی، کہ یہ کتاب کسی اور کی لکھی ہوتی۔ میرزا ایک خط میں انھیں لکھتے ہیں[3]

---

[1] اردوئے معلیٰ صہ ۱۳

[2] ایضاً صہ ۳۸۳

[3] ایضاً صہ ۱۶

"یہ ایک پارسل جو بعد دو پارسلوں کے بھیجا گیا ہے اس میں وہی لطائف غیبی ہے۔ جس کو میں نے اپنے مطالعہ میں رکھ کر صحیح کیا ہے اس کے بھیجنے سے یہ مدعا، کہ تم ان تینوں رسالوں کو اس کے مطابق صحیح کر لو"

اس سے عیاں ہے کہ کتاب میرزا نے لکھی تھی اور اب وہ اس کی غلطیاں درست کر کے سیاح کو بھیج رہے ہیں۔

(۴) لطائف غیبی کے دیباچے کا آخری فقرہ ہے:[1]

"مجھ کو تو حمیت اور رعایتِ حق اس تحریر کی باعث ہوئی تا کہ میں نے بیس لطائف جمع کیے اور اس نگارش کا لطائف غیبی نام رکھا۔

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گویم"

اس عبارت سے ظاہر ہے کہ سیاح تو درپسِ آئینہ طوطی صفت "بیٹھے ہیں۔ "استادِ ازل" (غالب) جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ دہرا رہے ہیں۔ میرے خیال میں تو کتاب کا نام لطائف غیبی بجائے خود غمازی کر رہا ہے کہ ع

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں

(۵) ان شہادتوں کے علاوہ سب سے بڑی داخلی شہادت لطائف غیبی کا

---

[1] لطائف غیبی صفحہ ۲

اسلوب بیان و طرزِ تحریر ہے۔ سیّاح کی اپنی لکھی ہوئی کتاب "سیرِ سیّاح" موجود ہے، جو ۱۸۷۲ء (۱۲۸۸ھ) میں چھپی تھی۔ اس میں انھوں نے لکھنؤ اور کانپور کے دو مشاعروں اور بعض اور مقامات کا حال لکھا ہے۔ ساری کتاب میں صرف پانچ چھ صفحے نثر کے ہیں لیکن اس کا بھی یہ حال ہے، کہ شروع سے آخر تک مسجّع اور مقفّیٰ فقرے ہیں اور تصنّع اور آورد سے کوئی سطر خالی نہیں۔ اس کی نثر کو "لطائفِ غیبی" سے کیا نسبت، جس میں بے ساختگی اور آمد کا یہ عالم ہے کہ نگاہ کہیں رُکتی ہی نہیں۔ اور اس پر ظرافت اور بذلہ سنجی فقرے فقرے سے عیاں، جو غالب کی تحریر کا طرۂ امتیاز ہے۔

غرض کہ ان تمام باتوں کو مدِّنظر رکھتے ہوئے، ہم اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ "لطائفِ غیبی" میرزا کی تصنیف ہے۔ میاں داد خاں زیادہ سے زیادہ جامع کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جیسا کہ 'درفشِ کاویانی' کے آخر میں سیّاح کی تاریخ کا عنوان بھی "جامع لطائفِ غیبی" ہے۔

غالب نے اپنی ساٹھ سالہ ادبی زندگی میں چار کتابیں فارسی نثر میں اور دو نظم میں لکھیں۔ اردو میں ان کا سارا سرمایہ ایک مختصر دیوان اور خطوط کے مجموعوں کے علاوہ دو تین اور چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ ساٹھ سال کی لمبی مدت کا یہ ثمرہ بلحاظ مقدار کچھ ایسا قابلِ توجہ یا مہتم بالشان نہیں۔ خود انھیں بھی اس کا اعتراف تھا۔ مگر حالات کی نامساعدت اور ابنائے دہر کی ناقدری نے ان کے تمام ولولوں کو سرد کر دیا۔ وہ خود کہتے ہیں[۱] کہ میں زمانے

---

[۱] کلیاتِ نثر صفحہ ۱۵۰ (بنام مولوی سراج الدین احمد)

سے زیادہ نہیں تھوڑی سی آسائش اور اطمینانِ قلب چاہتا تھا۔ اگر یہ مجھے میسّر آجاتی تو میں تخیل کی بلند پروازی سے اربابِ فن سے داد حاصل کرتا لیکن دیکھا جائے تو جو کچھ انھوں نے اس پریشان حالی میں بھی لکھا اور صفحۂ قرطاس پر جو نقشِ جاوداں بنائے ان کی قدر و قیمت کا اندازہ کس نے کیا اور اس کی صحیح داد بھی انھیں کب ملی۔

"مہرِ نیم روز" میں بہادر شاہ کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں[1]:۔

"کہتے ہیں، صاحبقران ثانی شاہ جہاں نے کلیم کو سیم و زر اور لعل و گہر سے تلوایا تھا۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ زیادہ نہیں تو آپ سخن سنج حضرات کو حکم دیں کہ وہ ایک بار میرے کلام ہی کو کلیمؔ کے کلام کے ساتھ تولنے کی زحمت گوارا فرمائیں۔"

مولانا حالیؔ اس پر لکھتے ہیں[2]:۔

"اس مضمون کو جو لوگ میرزا کے رُتبے سے واقف نہیں ہیں، شاید خود ستائی اور تعلّی پر محمول کریں گے۔ مگر ہمارے نزدیک میرزا نے اس میں کچھ بھی مبالغہ نہیں کیا بلکہ بالکل وہی کہا ہے جو ان کے زمانے کے اہلِ نظر اور اہلِ تمیز ان کی نسبت رائے رکھتے تھے۔"

خود میرزا کو گہرا احساس تھا کہ لوگوں نے میرے صحیح مرتبے اور مقام کا اندازہ

---

[1] کلیاتِ نثر صفحہ ۲۶۹

[2] یادگارِ غالب صفحہ ۲۲

نہیں لگایا۔ اور افسوس کرتے ہیں کہ دنیا اپنی کم نظری کے سبب میری صلاحیتوں سے کما حقہٗ مستفیض نہیں ہوئی۔ فرماتے ہیں ؎:-

"پنجاہ و دو سال مغزِ سخن کافتم، امروز کہ شصت و ششمین سال از عمرِ گذراں می گزرد، سخن آفریں را سپاس گزارم و ہم جز آں بخشندۂ بخشائش گر کس نیارد دانست، کہ دریں پنجاہ و دو سال، چہ دُر ہائے معنی، بروئے من کشادہ اند، و کرسیِ اندیشۂ مرا در فرازستانِ آگہی بکدام پایہ نہادہ اند، حیف کہ ابنائے روزگار حسنِ گفتارِ مرا نشناختند، مرا خود دل برآناں می سوزد، کہ کامیاب شناسائے فرۂ ایزدی نگشتند و ازیں نمائش ہائے نظر فروز، کہ در نظم و نثر بکار بردہ ام، سر گراں گزشتند۔ گوئی نظیری ہمدردِ من و مقطعِ آں مینو آرامشگاہ نوائے سازِ دمِ سردِ من است ؎

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدرِ تو نشناخت دریغ

؎ درفشِ کاویانی صط ۱۳۱-۱۳۲

تیسرا باب

عادات و اخلاق

حلیہ میرزا ایک تازہ وارد ولائتی خاندان کے چشم و چراغ تھے، اس لیے ان کا چہرہ مہرہ اور خدوخال ابھی مسخ نہیں ہونے پائے تھے اور ان میں اپنی قوم کی جملہ خصوصیات موجود تھیں۔ ان کی بڑی عمر کی تصویروں سے بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ اپنے شباب میں نہایت خوش رو اور حسین رہے ہوں گے۔ چوڑا چکلا ہاڑ، لانبا قد، سڈول اکہرا جسم، بھرے بھرے ہاتھ پاؤں، کتابی چہرہ، کھڑا نقشہ، چوڑی پیشانی، ناک کی کاٹھی اونچی، رخسار کی ہڈی نسبتاً ابھری ہوئی، گھنی لانبی پلکیں اور بڑی بڑی بادامی آنکھیں، کان بڑے، سرخ و سپید رنگ، جس میں شراب نوشی نے چمپئی دمک پیدا کر دی تھی۔ شراب نوشی ہی کے باعث اخیر عمر میں پاؤں کی انگلیاں سوج کر اینٹھ گئی تھیں، جس سے چلنے میں تکلیف ہوتی تھی۔

جوانی میں ڈاڑھی منڈاتے اور سر پر پٹھے رکھتے تھے جب کہولت کا زمانہ آیا اور ڈاڑھی مونچھ میں سپید بال آگئے، تو ڈاڑھی منڈانا ترک کر دی۔ کیوں کہ دوسرے تیسرے سفید کھونٹی نکل آتی اور بدنما معلوم ہوتی تھی۔

داڑھی زیادہ لمبی مولویانہ طرز کی نہیں رکھتے تھے، بلکہ کٹواتے تھے۔ یہ دو ڈھائی انگل سے زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ دہلی کے عوام کی وضع تھی، منہ پر داڑھی، سر پر بال۔ انھوں نے یہاں بھی اپنی انفرادیت قائم رکھی جس دن داڑھی بڑھائی، اسی دن سر منڈایا۔ جوانی میں مسّی کا بھی استعمال کرتے تھے جب سامنے کے دونوں دانت ٹوٹ گئے، تو یہ بھی ترک کر دی۔ لمبا قد ہونے کی وجہ سے اخیر عمر میں کمر میں ذرا خم آگیا تھا اور جھک کر چلتے تھے۔

لباس میرزا خود رئیس ابنِ رئیس تھے۔ رئیسوں سے رشتہ داری اور یارانہ تھا۔ بادشاہوں اور نوابوں کے اُستاد تھے اس لئے ان کی فطری رکھ رکھاؤ کی عادت اور نفاست پسندی المضاعف ہو گئی۔ بالعموم اس کے بیرونی اظہار کا مقام لباس ہوا کرتا ہے۔ وہ گھر پر دہلی کے شرفا کی طرح، بر کا پاجامہ اور کھلی آستین کا الفی گریبان کا کرتا یا انگرکھا پہنتے تھے۔ سر پر عام طور پر ململ کی گول ہلکی ٹوپی ہوتی جس پر کامدانی یا کشیدے کڑھائی کا کام ہوتا تھا۔ جاڑوں میں سردی سے بچنے کے لئے کسی گرم کپڑے کا کلی دار پاجامہ اور مرزئی پہنتے تھے۔ باہر نکلتے تو تنگ مہری کا آڑا پاجامہ، کرتا اور اس پر صدری یا جامہ دار کی چپکن اور اس پر نیمہ آستین۔ اوپر کسی بھاری اور قیمتی کپڑے کی قبا یا چغہ اور اس پر ایک جامہ۔ پاؤں میں گھیتلی جوتی یا نوکدار کفشی اور ہاتھ میں موٹھ دار، مضبوط، لمبی لکڑی۔ اس کی شام پر کندہ تھا "یا اسد اللہ الغالب"[1]

---

[1] نیر رخشاں کی رباعی ہے سہ (باقی اگلے صفحے کے نیچے)

بعض اوقات ایک شالی رومال بھی کندھوں پر ڈال لیتے یعنی رومال کا سموسہ بنا کے اسے اس طرح پشت پر ڈال دیتے کہ اس کا ایک کونہ پیٹھ پر لٹکتا رہتا اور دوسرے دونوں کنارے شانوں سے گذر کر سینے پر آ رہتے یا پھر سادہ طریقے پر گردن کے گرد ایک چکر دے کر اسے آگے پیچھے چھوڑ دیتے۔ سر پر عموماً کلاہ پاپاخ یا سیاہ پوستین کی جو گوشہ لمبی ٹوپی ہوتی تھی کبھی کبھی مغلئی انداز کا پٹکا بھی باندھتے تھے۔ یعنی نیچے مخروطی کلاہ اور اس پر دستار۔ ایک خط میں انھوں نے منشی جواہر سنگھ جوہر سے ریشمی لنگی کی فرمائش کی ہے۔ اس میں لنگی کی وضع قطع سے متعلق جو ہدایتیں لکھی ہیں، ان سے ان کی عام عادات اور حسنِ مذاق کا نہایت صحیح اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ لکھتے ہیں سے

"تمھیں یاد ہوگا کہ میرے پاس برہ کی پوستین کی ٹوپی تھی۔ وہ اب کرم خوردہ ہو گئی ہے اور میرے سر پر کچھ نہیں مجھے ٹوپی کی حاجت نہیں البتہ ابریشمی لنگی چاہتا ہوں جیسی پیشاور اور ملتان میں بنتی ہے اور ان اطراف کے امرا اسے زیبِ سر کرتے ہیں۔ لیکن ایسی لنگی ہو کہ اس کے رنگ شوخ اور انگشت نما نہ ہوں۔ حاشیہ سرخ نہ ہو۔

(پچھلے صفحہ سے آگے)

اوستادِ من آں پیرِ حق آگہ غالب — اقلیم کلام را شہنشہ غالب
می داشت بعیسی گنہ چو مہر بدست — بد نقش بر آں "یا اسد اللہ الغالب"

سے کلیات نثر صفحہ ۲۵۰، نیز اردوئے معلی صفحہ ۳۳۶ (بنام منشی جواہر سنگھ)

کام اگرچہ نازک اور نفیس ہو۔ لیکن سونے چاندی کے تار اس میں نہ صرف ہوئے ہوں۔ ابریشم سیاہ اور سبز اور خاکستری اور زرد، اس کے تار و پود میں استعمال ہوا ہو۔ غالباً اس طرح کی چیز اس علاقے میں جلد اور آسانی سے دستیاب ہو جائے گی۔ تلاش کریں اور مہیا کر کے ڈاک سے مجھے بھیج دیں اور قیمت بھی لکھیں۔ اگر قیمت نہیں لکھیں گے، تو میں نہیں لینے کا۔ ہدیہ و ارمغان وہ ہے جو بے طلب بھیجا جائے۔ جو چیز مانگنے سے دی جائے، وہ ہدیہ نہیں کہی جا سکتی۔ میری اس تحریر سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ میں تم سے ہدیہ قبول نہیں کرنا چاہتا، بلکہ لنگی کا خریدار ہوں۔ اگر بے مانگے کوئی چیز آئے گی تو میں اسے خوشی سے لوں گا۔ بہرحال لنگی کے بھیجنے میں توقف اور قیمت کے لکھنے میں تکلف نہ کیا جائے۔"

خوراک کھانے سے متعلق میرزا کا اصول یہ معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑا ہو اور لذیذ ہو۔

گرمی سردی ہر موسم میں صبح نہار منہ، سب سے پہلے ٹھنڈائی پیتے تھے یعنی مقشر باداموں کا شیرہ، مصری کے شربت کے ساتھ۔ بعض دوست جو انھیں مصری کا تحفہ بھیجتے تھے، وہ اسی تبرید کے کام آتی تھی۔ اس کے بعد پہر دن چڑھے ناشتہ ہوتا تھا۔

دوپہر کے کھانے میں گوشت ضرور ہوتا تھا۔ گوشت سے بہت رغبت تھی اور یہ کسی دن ناغہ نہیں ہوتا تھا۔ گوشت میں اس امر کا خیال رکھا جاتا

تھا کہ تازہ اور بے ریشہ ہو، تاکہ بوٹی پکنے پر نرم اور لذیذ رہے۔ بکری اور دُنبے کا گوشت زیادہ پسند تھا۔ بھیڑ کا پسند نہیں کرتے تھے۔ پرندوں میں مُرغ کبوتر اور بٹیر پسندِ خاطر تھا۔ ترکاریوں میں انھوں نے ایک جگہ کڑوے کریلوں اور املی کے کھٹے پھولوں کا ذکر کیا ہے۔ گوشت میں کبھی کبھی میوہ بھی ڈلوا لیتے تھے۔

جناب بگا بیگم فرماتی تھیں کہ ان کی عادت تھی کہ گوشت میں یا اور بھی جو سالن یا ترکاری پکی ہو، اس میں تھوڑی سی چنے کی دال ضرور پڑتی تھی اور مجھے چنے کی دال ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ اس لیے، میں جب رخصتی کے بعد گھر میں آئی، تو میری خاطر سے گوشت میں دال نہ ڈالی گئی، جب میرزا صاحب دوپہر کو کھانے پر بیٹھے تو دیکھا کہ سالن میں دال نہیں پڑی ہے۔ انھوں نے خیال کیا کہ شاید دال گھر میں ختم ہو چکی ہے، کہنے لگے بھئی اگر دال ہو چکی تھی تو یا خود کسی کو بھیج کے منگوالی ہوتی یا مجھ سے کہا ہوتا کہ میں منگوا دیتا۔ اس پر بیگم صاحبہ بولیں کہ نہیں دال تو گھر میں موجود ہے، لیکن بہو چنے کی دال نہیں کھاتی اس لیے، سالن میں نہیں ڈالی گئی۔ میرزا صاحب کو خدا ایسا موقع دے پٹ سے بول اُٹھے۔ اوہو، پھر تو بہو خدا سے بھی بڑھ گئیں۔ ارے چنا تو وہ چیز ہے کہ اس پر خود اللہ میاں کی بھی رال ٹپک پڑی تھی اور پھر مزے مزے سے لگے وہ مشہور لطیفہ سنانے، اور کہا کہ پس جب بہو چنے کی دال نہیں کھاتی، تو یہ تو خود خدا سے بھی بڑی ہوئی۔ گھر بھر میں سب کا مارے ہنسی کے بُرا حال تھا۔ میں ان کی لطیفہ بازی کی عادت سے کچھ ایسی واقف نہیں تھی۔ سخت شرمندہ ہوئی اور جی میں ٹھان لی کہ آج سے کبھی کھانے کے معاملے

میں دخل نہیں دوں گی، لیکن میری ساس نے مجھ سے کہا کہ بیٹی، بُرا ماننے کی کوئی بات نہیں، ان کی ہنسی مذاق کی عادت ہے۔ ان کی بات دل پر نہ رکھو۔ اس کے بعد میں نے چنے کی دال پر تو کبھی اعتراض نہیں کیا۔ ہاں خود نہیں کھاتی تھی اور گوشت یا جو ترکاری پکتی، اس میں سے علیحدہ کر کے کھا لیتی۔

اچھی قسم کے چاولوں کے بھی دل دادہ تھے۔ لیکن چوں کہ قبض کی تکلیف ہمیشہ بلائے جان رہی، اس لیے نئے چاولوں سے گھبراتے تھے کہ قابض ہوتے ہیں۔ پُرانے چاولوں کو ترجیح دیتے تھے جو پتلے بھی ہوں اور لمبے بھی اور کچے پر بڑھیں۔

جب تک صحت ٹھیک رہی اور معدہ بھی درست تھا، دوپہر کے کھانے میں گوشت کے علاوہ روٹی بھی ہوتی تھی۔ گوشت کی مقدار آدھ سیر کے قریب ہوا کرتی تھی۔ اگر سالن میں شوربہ ہوا تو بالعموم روٹی کا چھلکا اس میں بھگو بھگو کر کھاتے تھے۔ جب صحت نے جواب دے دیا اور معدہ کمزور ہو گیا تو روٹی اور چاول دونوں چھوڑ دیئے۔ دوپہر کو سیر بھر گوشت کی گاڑھی یخنی اور سرِ شام کبھی کبھی تین چار تلے ہوئے شامی کباب۔ کھانا بہت ابتدائی زمانے سے دن میں صرف ایک ہی وقت، دوپہر کو کھاتے تھے۔ رات کو کبھی کھایا ہی نہیں۔ بلکہ ان کے ایک خط سے جو انھوں نے کلکتہ کے قیام کے زمانے میں لکھا ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ اتوار کے دن گوشت بھی نہیں کھاتے تھے۔[۵] خدا معلوم

---

۵ مآثرِ غالب۔ صفحہ ۲۰ (خط ۱۷)

یہ ہمیشہ کا دستور تھا یا عارضی بات تھی۔

گرمیوں میں ٹھنڈے پانی پر جان دیتے تھے۔ اگر برف دستیاب ہو جاتی تو ذخیرہ کر رکھتے ورنہ صراحی پر تر صافیاں لپیٹ دیتے تاکہ پانی ٹھنڈا رہے۔

پھل پھلوں میں انگور اور آم دونوں خاص طور پر بہت مرغوب تھے۔ ایک دفعہ برسات کے شروع میں نواب علاء الدین احمد خاں نے انھیں لوہارو آنے کی دعوت دی تو انھوں نے مذاق مذاق میں لکھا کہ میں اندھا ہوں کہ اس موسم میں دہلی چھوڑ کر لوہارو جاؤں۔ اُس ویرانے میں نہ آم، نہ انگور، نہ کوئی اور لطف۔ نا صاحب، میں آج کل نہیں آسکتا۔

آموں سے ان کی رغبت کا سب دوستوں کو علم تھا اور جہاں جہاں آم افراط سے ہوتا ہے، وہاں کے دوست احباب انھیں فصل میں سوغات کے طور پر بھیجے رہتے اور وہ خود بھی فرمائش کر کے دوستوں سے منگواتے رہتے تھے۔ کلکتہ کے سفر میں انھیں بنگال کے آم بہت پسند آئے تھے اور انھوں نے ایک جگہ ان کا ذکر اثمارِ بہشتی کے مقابلے پر کیا ہے ؎

ہمہ گر میوۂ فردوس بخوانت باشد
غالب آں انبۂ بنگالہ فراموش مباد

ایک مرتبہ میرزا فخرو ولی عہد نے اپنے خاص باغ سے آموں کا تحفہ بھیجا تو اس پر انھوں نے اردو میں ایک مختصر مثنوی آموں کی تعریف میں کہی جو ان کے دیوان میں موجود ہے۔ ایک خط میں اپنے آم کھانے کا حال یوں لکھا ہے؎[۱]

"ان دنوں میں کہ دل بھی تھا اور طاقت بھی تھی، شیخ محسن الدین مرحوم

---

[۱] اردوئے معلی۔ صفحہ ۱۸۱ (بنام چودھری عبدالغفور سرور)

سے بطریقِ تمنا کہا گیا تھا کہ جی یوں چاہتا ہے، کہ برسات میں مار بیرہ جاؤں، اور دل کھول کر، اور پیٹ بھر کر، آم کھاؤں۔ اب وہ دل کہاں سے لاؤں۔ طاقت کہاں سے پاؤں۔ نہ آموں کی طرف وہ رغبت، نہ معدہ میں اتنی آموں کی گنجائش۔ نہار منہ، میں آم نہ کھاتا تھا۔ کھانے کے بعد میں آم نہ کھاتا تھا۔ رات کو کچھ کھاتا ہی نہیں، جو کہوں بین الطعامین۔ ہاں، آخرِ روز، بعد ہضمِ معدہ، آم کھانے بیٹھ جاتا تھا۔ بے تکلف عرض کرتا ہوں۔ اتنے آم کھاتا تھا، پیٹ اپھر جاتا تھا اور دم پیٹ میں نہ سماتا تھا۔ اب بھی اسی وقت کھاتا ہوں، مگر دس بارہ۔ اگر پیوندی آم بڑے ہوئے تو پانچ سات۔"

حقہ اور پان حقہ بھی پیتے تھے اور اس کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ صبح، دوپہر، شام جب چاہا تازہ کروالیا۔ کام کر رہے ہیں اور حقے کا کش لگ رہا ہے۔ تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ حقے کی ظاہری شکل صورت کا بھی خیال رکھتے تھے اور پیچوان کو ترجیح دیتے تھے۔ پان نہیں کھاتے تھے۔

شراب میرزا نے اپنی زندگی جس ناپسندیدہ طریقے پر شروع کی تھی، اس کا ذکر انھوں نے کئی جگہ کیا ہے۔ بارے بعد میں وہ بہت کچھ سنبھل گئے اور انھوں نے اکثر باتوں میں معتدل روش اختیار کرلی۔ البتہ یہ کافر شراب ایسی ان کے منہ لگی کہ آخر دم تک نہ چھٹی۔ اوّل اوّل انھوں نے کوئی اصول نہیں قائم کر رکھا تھا یعنی شام کے علاوہ، دن کے بعض اوقات میں بھی پی لیتے تھے "ابر و باراں میں یا پیش از طعامِ چاشت، یا قریبِ شام،

جب جی چاہا تین چار گلاس پی لئے اور شراب شبانہ میں مجرا نہ لیتے۔" لیکن جلد ہی انھوں نے محسوس کر لیا کہ اس بے اعتدالی کا نتیجہ سراسر نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تو انھوں نے خیاؔم کے مشورے پر عمل شروع کیا کہ ؎ اندک خور و گاہ گاہ خور و پنہاں خور۔ دن کا پینا بالکل ترک کر دیا اور صرف شام پر اکتفا کی اور وہ بھی مقدار میں کم۔ یہ معمول آخر تک رہا اور یہ عادت ایسی راسخ تھی کہ اگر سر شام انھیں شراب پینے کو نہ ملتی تو رات بھر نیند نہیں آتی تھی۔ ابتدا میں روزانہ پاؤ بھر کے قریب پیتے رہے لیکن آخری ایام میں جب تندرستی خراب ہو گئی اور احتراق خون سے بیمار رہنے لگے تو یہ مقدار گھٹ کر صرف چند تولے رہ گئی تھی۔ شراب کی حدّت اور تیزی کم کرنے کو اس میں دو تین حصے گلاب ملا لیا کرتے تھے، چنانچہ خود ایک شعر میں لکھتے ہیں ؎

آسودہ باد خاطرِ غالبؔ کہ خوے اوست
آمیختن بہ بادۂ صافی، گلاب را

میر مہدی مجروحؔ کا ایک شعر ہے ؎

غالبؔ آئے ہیں، لاؤ لے مجروحؔ
بادۂ ناب میں ملا کے گلاب

مولانا عبدالحق صاحب نے میر افضل علی عرف میرن صاحب کے حال میں میرزا کی شراب نوشی سے متعلق ایک دلچسپ روایت بیان کی ہے جس سے ان کے شراب پینے کے طریقے پر روشنی پڑتی ہے۔ لکھتے ہیں: ؎

؎ اُردو جنوری ۱۹۳۶ء یہ مضمون ان کے مجموعہ مضامین "چند ہم عصر" میں بھی شامل ہے۔ (صفحہ ۱۷۵-۱۷۶)

"ایک بار کا ذکر ہے کہ حیدر آباد کے ایک وکیل صاحب کسی سے ذکر کر رہے تھے کہ میرزا غالب شراب پیتے تھے۔ میر صاحب (یعنی میرن صاحب) قریب کے کمرے میں کپڑے بدل رہے تھے۔ ان کے کان میں اس کی بھنک جا پڑی، ویسے ہی باہر نکل آئے۔ وکیل صاحب پر بہت بگڑے اور بہت بُرا بھلا کہا۔ جب ذرا ٹھنڈے ہوئے تو میں نے پوچھا، تو کیا یہ غلط ہے کہ میرزا صاحب شراب پیتے تھے۔ کہنے لگے، یہ لوگ کیا جانیں۔ یونہی جو جی میں آیا، بک دیتے ہیں۔ اب انھوں نے بیان کرنا شروع کیا کہ کس طرح پاک، صاف ستھرے آبخورے میں تھوڑی سی ڈالی جاتی اور اس میں گلاب ملایا جاتا اور اس پر صافی لپیٹ کر اُدھر ہوا میں لٹکا دیا جاتا۔ رات کے وقت جب کوئی نہیں ہوتا تھا اور صرف میں یا میر مجروح ہوتے تو اس وقت لے پیتے۔ اس کے بعد ہزار توبہ استغفار کرتے۔ غرض انھوں نے میرزا صاحب کی مے نوشی کو طول دے دے کر ایسے عجیب طور سے بیان کیا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ شراب نہ تھی بلکہ آبِ کوثر تھا۔"

مرزا محمد حسن خاں عرف خضر مرزا (عارف کے بھتیجے) فرماتے ہیں ؎

"شراب پینے میں ان کا دستور تھا کہ کلو دار دغ گلاس دھو کر آدھ پاؤ شراب اس میں ڈال دیتا اور گلاس ڈھانک کر ان کے پاس رکھ دیا کرتا تھا

؎ ادبی دنیا سالنامہ (۱۹۴۰ء) صفحہ ۲۴۶

موسم گرما میں، شراب کا گلاس لال قند کے کپڑے میں لپیٹ کر رکھا جاتا تھا۔ کپڑے کو برف سے تر کر دیتے تھے۔ اتنا تر ہو جاتا کہ پانی ٹپکنے لگتا۔ مغرب کی اذان ہونے پر شراب پیتے تھے۔ ایک قاب میں بادام، نمک میں پڑے ہوئے، گھی میں تلے ہوئے، پاس ہی پڑے رہتے تھے۔ چار بادام منہ میں ڈال لیتے اور شراب کا گھونٹ لیتے اور ساتھ ساتھ غزل لکھتے جاتے تھے۔ شعر لکھتے تھے اور کاٹتے تھے۔ پھر لکھتے تھے اور کاٹتے تھے یہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

مولانا حالی فرماتے ہیں کہ رات کی شراب کی جو مقدار مقرر کر لی تھی، اس سے زیادہ کبھی نہیں پیتے تھے۔ جس صندوق میں بوتلیں رکھتے تھے اس کی چابی کلو داروغہ کے پاس رہتی تھی اور اسے تاکید سے کہہ رکھا تھا کہ رات کو کبھی سرخوشی کے عالم میں مجھے زیادہ پینے کا خیال پیدا ہو تو میرا کہا نہ ماننا اور طلب کرنے پر کنجی نہ دینا۔⁵

یہ نہیں کہ وہ شراب نوشی کو برا نہیں سمجھتے تھے یا انھیں اس پر فخر تھا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ اس سے پشیمان تھے۔ وہ "ثوابِ طاعت و زہد" جانتے تھے لیکن اپنی طبیعت کی اُفتاد سے مجبور تھے اور اس پر عمل نہیں کر سکتے تھے۔ چوں کہ یہ بری عادت انھیں پڑ گئی تھی اور وہ اسے بالکل چھوڑنے پر قادر نہیں تھے اس لیے انھوں نے کم از کم یہ اصول بنا لیا تھا کہ صرف تنہائی

---

۵ یادگارِ غالب۔ صفحہ ۶۲

میں یا پھر نہایت بے تکلف اور گہرے دوستوں کی موجودگی میں پیتے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ پابندی صرف ان کی شرم اور پشیمانی ہی کا نتیجہ ہو سکتی ہے۔

اپنی شراب نوشی کی ایک جگہ انھوں نے توجیہ بھی کی ہے ؎

مے سے غرض نشاط ہے کس روسیہ کو
اک گونہ بے خودی مجھے دن رات چاہیے

ممکن ہے کہ اوائل عمر میں انھوں نے واقعی نشاط اور عیش و عشرت کے لئے پینا شروع کیا ہو، لیکن بعد میں جب انھیں مادی اور ذہنی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا، تو یہ بات باور کی جا سکتی ہے کہ شاید اس زمانے میں انھوں نے اس سے اپنی مصیبتوں کے بھلانے میں مدد لی ہو۔ بہر حال آخیر عمر میں جب اس کی مقدار اتنی تھوڑی رہ گئی تھی، نہیں کہا جا سکتا کہ اس سے وہ کوئی سرور حاصل کرتے ہوں گے، بلکہ یہ محض طبیعتِ ثانیہ بن گئی تھی جس سے وہ باز نہیں رہ سکتے تھے۔

میرزا ہمیشہ ولائتی شراب پیتے تھے اور وہ بھی خاص طور پر اولڈ ٹام اور کاس ٹیلن۔ گڑ چھال کی دیسی شراب انھیں پسند نہیں تھی اور یہ انھیں راس بھی نہیں آتی تھی۔ چنان چہ ایک شعر میں اس کی شکایت کی ہے ؎

غالبؔ شرابِ قندیٔ ہندم کباب کرد
زیں بعد بادہ ہائے گوارا کشیدہ باد

غدر کے زمانے میں انھیں بہت تکلیف ہوئی۔ شہر میں ولائتی شراب کم ہو گئی،

اور اس کی قیمت بھی بہت چڑھ گئی۔ جہاں پہلے بیس پچیس روپے درجن کے دام تھے اب بڑھ کر پچاس ساٹھ میں بکنے لگی۔ میرزا کا یہ مقدور کہاں کہ اتنے مہنگے داموں خرید سکتے۔ اس لئے انھوں نے کوشش کی کہ کانپور سے منگوائی جائے[1] لیکن جب معلوم ہوا کہ وہاں بھی یہی نرخ ہے تو قہرِ درویش بر جانِ درویش چپکے ہو رہے۔ اس زمانے میں ان کے دوست ہیمِلٹن داس آنریری مجسٹریٹ دہلی نے انھیں دیسی شراب قند تحفے کے طور پر پیش کی، جو رنگ و بو میں ولائتی سے کم نہیں تھی۔ میرزا نے اسے بہت پسند کیا اور اس پر ایک رُباعی کہی ؎

از دہر، دلم دایہ، زہر ور می جُست — از بادۂ ناب، یک دو ساغر می جُست
فرزانہ ہیمِلٹن داس، بخشید بہ من — آبے کہ برائے خود سکندر می جُست

یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد وہ شرابِ "خانہ ساز" ہی استعمال کرتے رہے۔ کبھی کبھی گھر پر بھی کشید کر لیتے تھے۔ جب محکمۂ آبکاری قائم ہوا اور حکام کی طرف سے گھروں میں شراب تیار کرنے پر پابندی عائد ہو گئی تو انھوں نے ایک خط میں اس کی شکایت لکھی ہے۔[2]

میرزا نے ایک مقطع میں اپنی ان تمام مرغوب اشیا کا یکجا ذکر کیا ہے ؎

غالب، من و خدا، کہ سرانجامِ برشگال
غیر از شراب و انبہ و برفاب و قند نیست

---

[1] اردوئے معلیٰ صہ ۲۸۵ (بنام ہرگوبند سہائے)

[2] اردوئے معلیٰ صہ ۱۴۷، خطوط غالب (۱: ۲۲۷) (بنام حکیم غلام نجف خاں)

سکونت عین ممکن ہے کہ جب وہ دہلی آئے ہیں تو شروع میں کچھ دن سسرال کے ساتھ رہے ہوں۔ اس صورت میں گویا سب سے پہلے وہ دہلی میں قاسم جان کی گلی میں رہے۔ لیکن یوں معلوم ہوتا ہے کہ جلد ہی انھوں نے اپنا الگ مکان لے لیا۔ پہلے پہل انھوں نے جامع مسجد کے عقب میں مکان لیا تھا۔ اس کے بعد پھاٹک حبش خاں میں شعبان بیگ کی حویلی میں اُٹھ گئے۔ کلکتہ سے واپس آنے کے بعد وہ کھاری باؤلی میں نواب عبدالرحمٰن خاں کی حویلی میں رہے اور غدر سے دس پندرہ برس پہلے وہ بَلّی ماراں میں منتقل ہو گئے۔ اس کے بعد آخر تک لال کنواں اور بَلّی ماراں کا نواح نہیں چھوڑا۔ وہ دہلی میں ساٹھ برس کے لگ بھگ رہے لیکن ہمیشہ کرائے کے مکان میں۔ اپنا ذاتی مکان نہ بنایا نہ خریدا۔

مکان میں وہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ محل سرا اور دیوان خانہ علیحدہ علیحدہ ہوں۔ اگر دیوان خانہ بھی اسی مکان میں ہوتا تو وہ اس بات کو ترجیح دیتے تھے کہ اس کا دروازہ محل سرا سے الگ ہو، تاکہ دوست احباب مردانے میں بے جھجک آجا سکیں، ورنہ انھیں اس میں بھی کوئی اعتراض نہیں تھا کہ دونوں بالکل دو الگ الگ مکانوں میں ہوں۔ دونوں جگہ کے ملازم مخصوص تھے۔ نوکروں کے بارے میں ان کا ٹھاٹھ سدا امیرانہ، بلکہ مسرفانہ رہا۔ اندر باہر چار چار، پانچ پانچ نوکر بھرے تھے۔ سفر میں بھی نوکر ساتھ لے جاتے تھے۔ کلکتہ کے سفر میں ایک کہار اور دو ملازم دہلی سے لے گئے تھے۔ رام پور کے دونوں سفروں میں تین چار ملازم ساتھ تھے۔ نوکروں کی یہ

بھر یاران دونوں بھی قائم رہی جب، ۵۰ءمیں اور اس کے بعد بھی ان کا حال بہت پتلا تھا۔ اس زمانے میں ان کے پاس دو نوکر — کلو داروغہ اور کلیان — مردانے میں اور دو لونڈے — نیاز علی اور ایاز — اور ایک ددا اور ایک خادمہ وفادار، زنانے میں تھے۔ ان نوکروں کی تنخواہ ساٹھ روپے ماہانہ سے اوپر تھی۔ جب ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی مستقل آمدنی کبھی ایک سو ساٹھ سے زیادہ نہیں ہوئی تو ہر مہینے یہ ساٹھ باسٹھ روپے کا خرچ بہت زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ مدارِی اور کلو داروغہ اور کلیان، تینوں بہت لمبے عرصے تک ان کے پاس رہے بلکہ کلو کا انتقال بھی میرزا کے بعد اسی گھر میں ہوا۔ کلیان ہندو تھا۔

انھیں جانور پالنے کا بھی شوق تھا۔ بالخصوص جب باقر علی خاں اور حسین علی خاں، دونوں بھائی ان کے پاس آ گئے تو ان کی تفریح اور دلچسپی کے لئے وہ زیادہ اہتمام سے جانور رکھنے لگے تھے۔ باہر ان کی سواری کے لئے گھوڑے تھے، اندر بلی، مور، کبوتر، بٹیر، دنبہ، بکری۔ ان کے کلیات میں ایک قطعہ، بلی کی وفات پر موجود ہے جو ابتدائی زمانے کا کلام معلوم ہوتا ہے۔

مطالعہ شاعری ایک ایسا پیشہ ہے کہ اسے عمدگی سے نبھانے کے لئے وسیع مطالعے کی ضرورت ہے۔ شاعر اپنی زندگی کے چوبیس گھنٹے امتحان کے کمرے میں ہوتا ہے جہاں ہر کس و ناکس ممتحن ہے اور شاعر کا فرض ہے کہ وہ ان سب کو اطمینان بخش جواب دے اور پیشانی پر بل تک

نرلائے۔ میرزا بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں تھے، بلکہ ان کی ذمہ داریاں بہت زیادہ تھیں۔ اس آخری دور کی دہلی اپنی تمام بے سروسامانی کے باوجود عجیب شان رکھتی تھی۔ چراغ بجھنے سے پہلے اس کی لَو بھڑک اُٹھتی ہے یہی حال یہاں بھی ہوا۔ دہلی میں اردو فارسی کے مستند اساتذہ اور نقادانِ فن جمع ہو گئے تھے۔ پھر جتنا بڑا دعویٰ، اتنا ہی کڑا امتحان۔ میرزا کا یہ دعویٰ تھا کہ آج ہندوستان بھر میں میرے برابر کا فارسی دان نہیں۔ فارسی کی میزان میرے ہاتھ میں ہے۔ اس لئے ان کے کلام کو بہ نظرِ غائر دیکھنے والوں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ دوست اور مدّاح استفادے اور لطف اندوزی کے لئے دیکھتے تو مخالف اور منکر، اس کی خامیاں کھانے اور نکتہ چینی کے لئے۔ خوش قسمتی سے ابتدائے عمر میں میرزا کو مُلّا عبدالصمد جیسے فارسی اور عربی علوم کے ماہر اُستاد کی تربیت میسّر آگئی، لیکن تکمیل کے لئے وسیع مطالعے اور غور و فکر کی بھی ضرورت تھی، جو اپنے "زورِ بازو" ہی سے حاصل ہو سکتی تھی۔ میرزا کے کتنے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے قدیم شاعروں کا کلام بہت غور اور توجہ سے دیکھا تھا، یہی وجہ تھی کہ جب کبھی کسی نے ان کے کلام پر اعتراض کیا آخر حق ان کی جانب ثابت ہوا اور اساتذۂ سلف کے کلام سے سند مل گئی۔ ان کی وسعتِ مطالعہ اور فارسی سے ازلی لگاؤ کا اندازہ اس واقعہ سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ۱۰-۱۱ برس کی عمر میں وہ ظہوری کا دیوان اتنی توجہ اور انہماک سے دیکھ چکے تھے، کہ انھوں نے اسے ایک اعتراض کے جواب میں بطور سند پیش کر دیا۔ ان کا

یہ مطالعے کا شوق آخر تک قائم رہا۔ خواجہ عزیز الدین عزیز لکھنوی سے روایت ہے[1]۔ کہ جب میں ان کی زندگی کے بالکل آخری ایام میں ان کی ملاقات کو گیا تو دیکھا کہ غالباً قاآنی کا مطالعہ کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس زمانے میں انھوں نے چلنا پھرنا ترک کر دیا تھا اور سارا سارا دن بستر پر لیٹے رہتے تھے۔ کانوں سے بالکل سنائی نہیں دیتا تھا۔ بینائی بھی بہت کمزور ہو گئی تھی اور پڑھنے کے لئے عینک لگانے کی ضرورت پڑتی تھی۔

شعر و شاعری کے علاوہ، کہ یہ ان کا خاص موضوع تھا، انھیں قصے کہانی کی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ جن دنوں داستانِ امیر حمزہ اور بوستانِ خیال ان کے مطالعے میں تھیں، بہت خوش تھے۔ دیکھئے میر مہدی مجروح کو لکھتے ہیں[2]۔ اور کیسے ایک ایک لفظ سے مسرت ٹپک رہی ہے۔

"مولانا غالب علیہ الرحمتہ ان دنوں میں بہت خوش ہیں۔ پچاس ساٹھ جزو کی کتاب امیر حمزہ کی داستان کی، اور اسی قدر حجم کی ایک جلد بوستانِ خیال کی آگئی ہے۔ سترہ بوتلیں بادۂ ناب کی توشک خانے میں موجود ہیں۔ دن بھر کتاب دیکھا کرتے ہیں۔ رات بھر شراب پیا کرتے ہیں ؎

کسے، کیں مرادش میسّر بود
اگر جم نہ باشد سکندر بود

---

[1] اردوئے معلیٰ (دیباچہ ص ط)

[2] اردوئے معلیٰ ص ۱۲۴، خطوطِ غالب (۱: ۲۸۴)

یہ اسی مطالعے کا نتیجہ تھا کہ انھوں نے نواب کلب علی خان بہادر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا جس کی تشبیب اور مدح میں حمزہ اور اس کی اولاد اور اس داستان کے دوسرے افراد کا ذکر کیا ہے۔[۱]

لیکن کتابوں سے متعلق ان کا اصول یہ تھا کہ خریدتے نہیں تھے۔ دیکھنے کو لے لی اور واپس کر دی۔ حافظہ قوی تھا۔ ایک دفعہ کا دیکھا ہوا ذہن پر نقش ہو جاتا تھا۔ اکثر دوست احباب انھیں اپنی تصنیفات ہدیہ دیتے رہتے تھے، اگر چاہتے تو اچھا خاصہ کتاب خانہ فراہم ہو جاتا۔ لیکن انھوں نے کبھی کتاب اپنے پاس نہیں رکھی۔ جس نے مانگی اس کی نذر کر دی۔ غدر کے زمانے میں ان کے پاس صرف چھاپے کی برہانِ قاطع اور دساتیر تھی۔ بعد میں یہ برہانِ قاطع بھی نواب علاء الدین احمد خاں کو دے دی اور صرف دساتیر ان کے پاس رہ گئی۔ اسے وہ اپنا "ایمان اور حرزِ جان" کہتے تھے اور کسی کو نہیں دیتے تھے۔

کتابوں کے علاوہ اخبار بھی حتی الوسع دیکھتے رہتے تھے۔ ان کے خطوں میں دہلی اور لکھنؤ اور آگرہ اور کلکتہ کے متعدد اخباروں کے نام ملتے ہیں۔ اس کے دو سبب تھے۔ چوں کہ وہ درباری تھے اس لیے حکام کی نقل و حرکت اور ان کی تقرری اور تبدیلی کے کوائف سے آگاہ رہنا چاہتے تھے۔ یہ خبریں ان اخباروں میں چھپتی رہتی تھیں۔ اگر اخباروں سے مطلوبہ خبر نہیں ملتی تھی تو

---

[۱] مکاتیبِ غالب صفحہ ۱۴۱-۱۴۲ (مکاتیب)، یہ قصیدہ سبدِ چین میں شامل ہے (قصیدہ پنجم)

وہ دوستوں سے پوچھتے کہ جو انھیں معلوم ہو، وہ خود، اور جو نہیں معلوم، وہ کسی اور جگہ سے دریافت کر کے لکھیں۔ دوسرے کبھی کبھی ان پرچوں میں ادبی نوک جھونک بھی ہوتی رہتی اور شعراء کے کلام پر تنقید و تقریظ چھپتی رہتی۔ وہ خود بھی ان دلچسپیوں میں حصہ لینے سے گریز نہیں کرتے تھے۔ اس لئے ضرور تھا کہ وہ ان سے تعلق قائم رکھیں۔

خط و کتابت یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جا سکتی ہے کہ میرزا کی سی کامیاب خطوط نویسی بہت کم کسی کو نصیب ہوئی اِس میں ہرگز کسی طرح کا مبالغہ نہیں کہ ان کے خطوط اپنی طرز کی بے نظیر چیز ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان سے پہلے کسی نے خط لکھے نہیں، یا شائع نہیں کیے تھے۔ یہ بات نہیں ایسے بیسیوں مجموعے موجود ہیں ان سے پہلے کے جو خطوط ہمیں ملتے ہیں وہ تین بڑی قسموں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ مراسلات اور منشیات اور ملفوظات۔ مراسلات وہ خطوط ہیں جو شاہی درباروں کے پیشہ ور منشیوں نے لکھے تھے جیسے ابوالفضل کے خطوط۔ منشیات وہ ہیں جو زبان دان اور ادیب حضرات اپنی قادرالکلامی کے اظہار اور صنائع و بدائع کی مثالوں کے لئے لکھا کیے۔ ایسے کتنے مجموعے ملتے ہیں۔ سب سے آخر میں ملفوظات، وہ مکتوبات ہیں جو بعض صوفیہ کرام اور بزرگانِ دین کے باقیاتِ صالحات میں سے ہیں۔ اس صنف میں حضرت مجدد الف ثانی احمد سرہندیؒ کی تحریریں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ان تینوں میں سے آپ کو کسی میں بھی وہ چیز نہیں ملے گی جو غالب کے خطوط کا

طرۂ امتیاز ہے۔ یہ خطوط، لکھنے والے کی زندگی اور کردار کا آئینہ ہیں۔ انھیں تصنع اور آورد کی ہوا تک نہیں لگی۔ ان کے ایک ایک لفظ میں ایک زندہ شخصیت بول رہی ہے۔ یہی ان کی انفرادی خصوصیت ہے اور جب تک یہ دونوں زبانیں بولی اور سمجھی جائیں گی ان کی اس خوبی کا اعتراف کرنے والے بھی موجود رہیں گے۔

خلوص کے علاوہ ان خطوط کی ایک اور خصوصیت ان کا طرزِ تحریر ہے۔ یہ ایسا بدیع اور دل فریب ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے کوئی سامنے بیٹھا باتیں کر رہا ہے۔ خود میرزا بھی اپنے خطوں کی اس خصوصیت سے واقف تھے اور انھوں نے کتنی جگہ اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ انھوں نے پُرانا اسلوبِ تحریر بہت ابتدائی زمانے میں ترک کر دیا تھا یعنی جب انھوں نے ابھی اردو میں لکھنا شروع بھی نہیں کیا تھا۔ وہ ۱۸۲۸ء میں کلکتہ سے مولوی محمد علی خاں صدر امین باندہ کو لکھتے ہیں[۵] کہ میں چاہتا ہوں تحریر، تقریر سے کم نہ ہو۔ بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ قلم ہاتھ میں لیا۔ تقدیم و تاخیر سے قطع نظر، مدعا پیشِ نظر رکھتا ہوں اور درازیٔ سخن سے بے فکر باتیں کرتا چلا جاتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ پُرانے ڈھنگ کے لمبے لمبے القاب و آداب نہیں لکھتے۔ شروع میں ایک آدھ لفظ ایسا لکھا جو مخاطب کے حسبِ حال اور اسے متوجہ کرنے والا ہو۔ جیسے پیر و مرشد، حضرت، بھائی، یار، برخوردار اور

---

۵ کلیات نثر صفحہ ۱۴۹

اس کے بعد مطلب کی ضروری باتیں سپردِ قلم کر دیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لمبے لمبے القاب و آداب اور خیریت گوئی اور عافیت جوئی کے لئے طول کلامی سب لغو اور فضول باتیں ہیں۔ پختہ کار کو چاہیے کہ ایسی لغویات سے پرہیز کرے۔

اس ضروری اصلاح کو فارسی میں رواج دینا بہت مشکل تھا کیوں کہ ان کے مخاطب سب پرانی طرز کے بزرگ اور لکیر کے فقیر، روایت پرست حضرات تھے۔ اس کے باوجود ان کے فارسی خطوط دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یہاں بھی بہت حد تک کامیاب رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ ہر جگہ عبارت آرائی اور حشو و زواید سے اپنا دامن نہیں بچا سکے کیوں کہ ان کے لئے مکتوب الیہ کے مذاق اور افتادِ طبع کی رعایت ضروری تھی۔ لیکن پھر بھی ایسے خط جو سادگی اور بے ساختگی سے بالکل عاری ہوں بہت کم ہیں۔

اس کے مقابلے میں چوں کہ انھوں نے اردو میں خطوط نویسی بہت بعد میں شروع کی اور یہاں ان کے مخاطب عام طور پر نوجوان طبقے کے لوگ یا عزیز شاگرد تھے۔ اس لئے وہ اس تبدیلی پر نہ صرف یہ کہ معترض اور جز بز نہیں ہوئے بلکہ کسی حد تک خود ان کے معاون ہو گئے اور فرمائشیں کر کر کے ان سے یہ خط لکھواتے رہے۔

عموماً وہ خط لکھنے میں ابتدا نہیں کرتے تھے لیکن اگر کہیں سے خط آجاتا

---

۵۰ کلیات نثر صفحہ ۵

تو اس کا جواب ضرور لکھتے۔ غدر سے پہلے جب وہ قلعے میں ملازم تھے۔ تو بالعموم ان کا صبح کا وقت دربار میں گذرتا تھا۔ وہاں سے دوپہر کو واپس مکان پر آتے۔ کھانا کھانے کے بعد ظفر کی غزل بناتے۔ اس کے بعد جو وقت بچتا اس میں دوستوں کے خطوں کے جواب لکھتے۔ لیکن غدر میں ان کی دنیا سمٹ سمٹا کے گھر کی چار دیواری تک رہ گئی تھی، اس لئے وہ اپنا بیشتر وقت خط لکھنے میں گذارنے لگے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:ــ

"میں اس تنہائی میں صرف خطوں کے بھروسے جیتا ہوں، یعنی جس کا خط آیا، میں نے جانا، کہ وہ شخص تشریف لایا۔ خدا کا احسان ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں ہوتا، جو اطراف و جوانب سے دو چار خط نہیں آ رہتے ہوں۔ بلکہ ایسا بھی دن ہوتا ہے کہ دو دو بار ڈاک کا ہرکارہ خط لاتا ہے، ایک دو صبح کو اور ایک دو شام کو۔ میری دل لگی ہو جاتی ہے۔ دن ان کے پڑھنے اور جواب لکھنے میں گذر جاتا ہے۔"

میرزا کا خط نستعلیق شفیعا آمیز نہایت دلکش اور شیریں ہے۔ وہ خوشخط ہونے کے باوجود بہت زود نویس اور تیز دست تھے۔ ان کے جو خط چھپ چکے ہیں، حالانکہ انھیں لکھے ستر ستر، اسی اسی سال گذر چکے ہیں، وہ آج بھی پہلے دن کی طرح روشن اور نظر فروز ہیں۔ وہ خطوں کی نقل نہیں رکھتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ جب ان کے چھاپنے کا فیصلہ ہوا تو انھیں دوستوں سے ان

سے اردوئے معلیٰ صفحہ ۵۹، خطوط غالب (۱: ۶۱) (بنام تفتہ)

کی نقل طلب کرنی پڑی۔ غدر کے دنوں میں اگر بیکار وقت ہوتا تو وہ اپنے استعمال کے لیے لفافے گھر پر بنا لیا کرتے تھے۔ منشی شیو نرائن آرام کو معلوم ہوا تو انھوں نے خیال کیا کہ وہ بچت کے خیال سے ایسا کرتے ہیں، اس لئے انھوں نے اپنے مطبع میں لفافے چھاپ کے ان کی خدمت میں بھیج دیئے۔ ان پر از مقام .... در مقام .... تاریخ .... ماہ .... وغیرہ چھپا ہوا تھا۔ میرزا ان تصنعات اور قیود سے کوسوں دور بھاگنے والے۔ انھوں نے ایک بار تو ان کی خاطر سے لفافے رکھ لئے کہ وہ برا نہ مانیں البتہ خود استعمال نہیں کیے، اور دوستوں میں تقسیم کر دیئے۔ لیکن جب دوبارہ انھوں نے اسی طرح چھاپ کر ارسال کیے، تو میرزا نے یہ لکھتے ہوئے واپس کر دیئے کہ صاحب مجھے اس "از مقام، در مقام" سے الجھن ہوتی ہے۔ یہ لفافے مجھ سے لے لو اور ان کی جگہ سادے لفافے بھیج دو۔

انھیں اس بات کا بہت خیال رہتا تھا کہ ایسا نہ ہو خط کہیں راہ میں گم ہو جائے اور مکتوب الیہ تک نہ پہنچے۔ اس کا علاج انھوں نے یہ سوچا تھا کہ اگر خط میں کوئی ضروری اور اہم بات ہوئی تو اسے بیرنگ بھیج دیتے اور دوستوں کو بھی یہی مشورہ دیتے کہ ضروری خط بیرنگ بھیج دیا کریں، آدھ آنہ نہ سہی، ایک آنہ سہی۔ ایک دوست کو لکھتے ہیں:[ه] "ہر مہینہ میں آٹھ بیرنگ خط تک بلکہ سولہ خط تک میں نہ گھبراؤں گا۔"

[ه] اردوئے معلیٰ صفحہ ۴۴، خطوط غالب (۱: ۱۷۹-۱۸۰) (بنام قدر)

تصنیف و تالیف و شعر گوئی

میرزا کی نثر کی اکثر کتابیں مثلاً کلیاتِ نثر فارسی، قاطع برہان، اردو خطوط کے مجموعے، محض حسنِ اتفاق سے مرتب ہو گئے۔ قصد سے انھوں نے صرف دستنبو اور مہرِ نیم روز اور اردو کے دو ایک رسالے لکھے۔

انھوں نے ابتدا ہی تھوڑی مدت تک اسد تخلص کیا۔ چنانچہ جب تک وہ آگرہ میں رہے بلکہ قیامِ دہلی کے ابتدائی زمانے میں بھی اسد تخلص کرتے رہے۔ روایت ہے کہ کسی نے ان کے سامنے میر امانی اسد (شاگردِ سودا) کا یہ مطلع پڑھا ۔

اسد اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر شاباش، رحمت خدا کی

اور کہا، آپ نے یہ شعر خوب لکھا ہے اور اس کی بہت تعریف کی۔ میرزا کو ان جفا اور وفا، بت اور خدا، اسد اور شیر کے تلازموں سے دلی نفرت۔ بہت جھلائے اور اس شخص کو جواب دیا کہ صاحب، اگر یہ شعر میرا ہے، تو مجھ پر خدا کی لعنت اور اگر کسی اور کا ہے، تو اس پر بقول اس کے واقعی خدا کی رحمت ہو۔ غالباً کچھ اسی قسم کے التباس سے بچنے کے لئے انھوں نے اسد ترک کر کے غالب تخلص اختیار کر لیا۔ اس کی طرف ان کی رہنمائی حضرت علی کرم اللہ وجہٗ کے لقب "اسد اللہ الغالب" نے کی۔

فکرِ شعر میں عام شاعروں کی روش کبھی اختیار نہیں کی۔ اور شاعروں کی طرح یہ نہیں کہ کسی استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا، یا اس کے قوافی

لکھ لئے، اور ان قافیوں میں لکھنے لگے بلکہ وہ عموماً بحر اور ردیف کو ذہن میں رکھ لیتے اور پھر شعر لکھنا شروع کر دیتے تھے۔

ان کے نزدیک شاعری معنی آفرینی ہے قافیہ پیمائی نہیں۔ یہی سبب ہے کہ عام طور پر ان کی غزلیں لمبی نہیں۔ ان کے ہاں پندرہ سولہ بیت کی غزل شاذ و نادر ہوتی ہے۔ بالعموم دس بارہ شعر سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ درست ہے کہ وہ تلمیذ الرحمٰن تھے اور انھوں نے اپنا کلام کسی کو بغرضِ اصلاح نہیں دکھایا لیکن نسخۂ حمیدیہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اسے خود بہ نظرِ اصلاح دیکھتے اور اس میں ضروری ردّ و بدل کرتے رہتے تھے۔

مولانا حالی نے ان کی شعر گوئی کے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس سے ان کی قادر الکلامی اور قوتِ حافظہ دونوں کا ثبوت ملتا ہے۔ فرماتے ہیں:ؔ

"فکرِ شعر کا یہ طریقہ تھا کہ اکثر رات کو عالمِ سرخوشی میں فکر کیا کرتے تھے اور جب کوئی شعر سرانجام ہو جاتا تھا تو کمر بند میں ایک گرہ لگا لیتے تھے۔ اسی طرح آٹھ آٹھ، دس دس گرہیں لگا کر سو رہتے تھے اور دوسرے دن صرف یاد پر سوچ سوچ کر تمام اشعار قلم بند کر لیتے تھے۔"

میرزا مشاعروں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ ان کے فارسی اور اردو خطوں سے ان کا مشاعروں میں جانا ثابت ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں اجمیری دروازے

ؔ یادگارِ غالب صہ ۵۸-۵۹

کے باہر غازی الدین کے مدرسے (موجودہ دلّی کالج) میں ہر مہینے مشاعرہ ہوا کرتا تھا۔ پھر غدر سے پہلے شیفتہ اور آزردہ، ایک مدت تک التزام سے اپنے اپنے مکان پر مشاعرے کرتے رہے۔ قلعے میں بھی مشاعرے ہوا کرتے تھے جن میں بہادر شاہ ظفر بہت دلچسپی لیتے اور اپنا کلام بھیجتے تھے میرزا اکثر ان مشاعروں میں شامل ہوتے اور اپنا طرحی اور غیر طرحی کلام سناتے۔ وہ داد دینے والوں کا شکریہ نہایت متانت بلکہ کسی حد تک تمکنت سے ادا کرتے۔ ان کے رویے سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اسے اپنا جائز حق سمجھتے ہیں اور داد دینے والا ان پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔ پڑھنے میں ان کی آواز بلند اور مترنم اور دلکش ہوتی تھی۔ ایک مرتبہ انھوں نے بہادر شاہ ظفر کے سامنے قصیدہ پڑھا، تو ظفر نے ان کے پڑھنے کی تعریف کی اور کہا "میرزا تم پڑھتے خوب ہو" ظفر کے اس فقرے پر میرزا نے جو کچھ کہا ہے[۵] اس کے سمجھنے میں اکثر لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ انھوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ میرزا نے اس بات کا فخریہ ذکر کیا ہے، حالانکہ حقیقت میں وہ اسے حسرت سے بیان کر رہے ہیں کہ لے دے کے میرے پڑھنے کی تعریف کر دی اور کلام کی بلندی اور خوبی کا اندازہ تک نہیں لگایا۔

شاعری کی ایک صنف سے وہ بہت گھبراتے تھے۔ ان کے کلام میں تاریخیں ملتی ہیں لیکن حقیقت یہی ہے کہ ان کی طبیعت کو فنِ تاریخ و معمّے سے کوئی

---

۵ یادگار غالب (حالی) صفحہ ۸۱

مناسبت نہیں تھی۔ وہ اسے بہت گھٹیا قسم کی شاعری سمجھتے تھے۔ عام طور پر
دوسروں کے دیے ہوئے مادّے نظم کر دیا کرتے تھے۔ جہاں دو چار جگہ ان کے
کلام میں بے تکلف مادۂ تاریخ ملتا ہے یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ کسی اور کا بتایا
ہوا ہے۔ ورنہ جب بھی انھوں نے خود مادّہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے
ایسے ایسے عجیب غریب تعمیے اور تخرجے بہم پہنچائے ہیں کہ ان سے واقعی
مضحکہ خیز صورت پیدا ہو گئی ہے۔

شاعر کو اپنے کلام کے محفوظ اور مدوّن کرنے کا کس قدر خیال ہوتا ہے۔
مگر حیرت ہوتی ہے کہ میرزا نے کبھی اپنا کلام اپنے پاس نہیں رکھا، نہ کوئی
بیاض ہی اس مقصد کے لیے بنائی۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں اور
میرزا ذوالفقار الدین حیدر خاں عرف ناظر حسین میرزا نے التزام کر رکھا
تھا کہ ان کی نظم و نثر محفوظ کر لیتے۔ دونوں صاحبوں نے ان کے کلام کے
قلمی نسخے بہت اہتمام سے تیار کرائے تھے۔ جب غدر ہوا اور ان دونوں کے
گھر لُٹے تو کتب خانے بھی ورق ورق ہو گئے۔ ان کے ساتھ میرزا کے دیوان
بھی ضائع ہو گئے۔ خوش قسمتی سمجھیے کہ انھوں نے غدر سے پہلے اپنے اردو دیوان کا
ایک قلمی نسخہ رام پور بھیج دیا تھا۔ اگر وہ اسے وہاں نہ بھیج چکے ہوتے تو ان کے
کلام کا بھی وہی حشر ہوتا جو ذوقؔ کے ساتھ ہوا۔ اسی رام پوری نسخے کی نقل بعد
میں شائع ہوئی۔ اب بھی نہیں معلوم کتنا کلام ضائع ہو گیا ہوگا۔

مدح اگرچہ ان کا کلام تمام اصنافِ سخن میں موجود ہے اور وہ بہت حد تک
ہر جگہ کامیاب بھی ہیں، لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کا اصلی

میدان قصیدہ اور غزل ہے۔ اردو کلام میں قصیدے بہت کم ہیں۔ البتہ فارسی میں ان کی بہت بڑی تعداد ہے۔ سب سے زیادہ یعنی پندرہ پندرہ قصیدے بہادر شاہ ظفر کی مدح میں ہیں۔ بارہ، حمد و نعت و منقبت میں ہیں، چار نواب محمد یوسف علی خاں اور تین ان کے جانشیں نواب کلب علی خاں کی مدح میں ہیں۔ تین قصیدے ملکہ وکٹوریہ کے لئے اور سترہ ہندوستان کے مختلف وائسراؤں اور صوبوں کے گورنروں اور حکومت ہند کے سکرٹریوں کے لئے لکھے گئے ہیں۔ ان کے علاوہ بعض اور روٴسا اور احباب کی مدح میں بھی ان کے قصیدے موجود ہیں۔ انگریز حکام کی مدح میں قصیدوں پر متعدد اصحاب نے اعتراض کیا ہے لیکن ان سے متعلق ایک بات یاد رکھنا چاہیے کہ میرزا درباری تھے اور دربار میں ان کی نذر اشرفی دو اشرفی نقد نہیں، بلکہ یہی قصیدہ ہوا کرتا تھا پس جتنے وائسراؤں اور گورنروں کے درباروں میں وہ شامل ہوئے ہوں گے ان میں لازماً انھوں نے قصیدہ پیش کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ جس وائسرائے کے دربار میں وہ شامل نہیں ہوئے، اس کے لئے قصیدہ بھی نہیں لکھا۔ مثلاً لارڈ ڈلہوزی نے اپنے آٹھ سال کے دورِ حکومت (۱۸۴۸ء تا ۱۸۵۶ء) میں ایک بار بھی دہلی میں دربار نہیں کیا، اس لئے میرزا کے لئے، ان کے کسی دربار میں شامل ہونے کا موقع ہی نہیں تھا۔ چناں چہ ان کے کلام میں لارڈ ڈلہوزی کی مدح میں قصیدہ بھی کوئی نہیں۔ ایک اور بات بھی مدِ نظر رہے، کہ ان کی پنشن کا مقدمہ ایک مدت تک جاری رہا۔ حکومت ہند کے سکرٹریوں کے قصیدے بیشتر اسی سلسلے میں لکھے گئے تھے۔

ان کے قصیدوں کی تشبیب یا تمہید بہت شاندار اور پُر شکوہ ہوتی ہے اور اس میں وہ اپنا پورا زورِ کلام صرف کر دیتے ہیں۔ گریز عموماً بہت پُر لطف اور بے ساختہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد مدح بہت کم اور مختصر اور آخر میں دو ایک شعر میں دعا پر وہ قصیدہ ختم کر دیتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ وہ شاعر ہیں اور مدح بھی لکھتے ہیں لیکن ان کی مدح میں بے جا غلو اور اغراق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے جیسے انھوں نے خود ایک جگہ لکھا ہے وہ فقیر ضرور ہیں لیکن "فقیر متکبر" مثلاً غدر کے بعد جتنے عرصے تک ان کا دربار بند رہا، انھوں نے کسی انگریز کی مدح میں قصیدہ نہیں کہا۔ اس سے متعلق اپنے خاص انداز میں نواب علاؤ الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:[1]

"گورنمنٹ کا بھاٹ تھا، بھٹئی کرتا تھا، خلعت پاتا تھا، خلعت موقوف بھٹئی متروک۔"

یعنی انگریز کی قصیدہ خوانی، دربار و خلعت سے لازم ملزوم تھی، ورنہ وہ اپنے آپ کسی ستائش یا صلے کی خواہش سے یہ قصیدے نہیں لکھا کرتے تھے۔

ہجو بعض حضرات کی رائے یہ ہے کہ جو شاعر ہجو گو نہیں یا کم از کم ہجو کہنے پر قادر نہیں وہ اس شیر سے مشابہ ہے جو چنگال و دندان نہ رکھتا ہو یعنی دیکھنے میں وہ شیر ہے لیکن چوں کہ مخاطب کو معلوم ہے کہ وہ کوئی نقصان

[1] اردوئے معلیٰ صہ ۳۲۲، خطوط غالب (۱ = ۳۲۱)

نہیں بھیجا سکتا اس لئے وہ نہ اس سے ڈرتا ہے، نہ اس کی قدر کرتا ہے۔ اسی لئے مدح اور ہجو کا شروع سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے۔ ہجو، مدح گو شعرا کا بے خطا حربہ ہے۔ ممدوح جانتا ہے کہ اگر صلہ نہ دیا تو شاعر کے ترکش میں ایسے تیر بھی موجود ہیں، جن کے سوفار زہر میں بجھے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ مدح پر انعام دے کر اس بلا کو ٹالنے کی کوشش کرتا ہے۔

انوری نے اس مضمون کو نہایت لطیف پیرائے میں لکھ کر اپنے ممدوح کی خدمت میں بھیجا تھا۔ کہتا ہے:۔

سہ بیت رسم بود شاعرانِ طامع را | یکے مدیح و دگر قطعۂ تقاضائی
اگر بداد، سوم شکر، ورنہ داد، ہجا | ازیں سہ بیت، دو گفتم، دگر چہ فرمائی

یعنی مدح گو اور انعام کے خواہش مند شاعر تین قسم کا کلام لکھتے ہیں۔ اول قصیدہ پھر صلہ کے لئے تقاضا۔ اس کے بعد اگر انعام مل گیا تو شکریہ ورنہ ہجو۔ میں ان میں سے پہلے دو لکھ چکا ہوں۔ اب تیسرے سے متعلق ارشاد ہو کہ کون سا لکھوں۔

میرزا کا دامن اپنے کسی ممدوح کی ہجو سے ملوث نہیں ہوا۔ البتہ وہ تقاضے کی حد تک ضرور گئے ہیں۔ انھوں نے نواب وزیر الدولہ رئیس ٹونک کی مدح میں قصیدہ[1] لکھا لیکن جب اُدھر سے صلہ ملنے میں دیر ہوئی تو انھوں نے ایک بہت دلچسپ قطعہ[2] لکھا جس میں انعام نہ پہنچنے کی یہ توجیہ کی ہے کہ ممدوح مختلف

---

[1] قصیدہ ۵۷ (کلیات غالب نظم فارسی)
[2] قطعہ ۲۲ (سبد چین) صفحہ ۴۶ - ۴۷

دیار و امصار سے انعام کے لئے اشیا، جمع کر رہا ہے۔ دمشق سے دیبا، اور روم سے مخمل۔ دکن سے ہاتھی اور عراق سے گھوڑے۔ نیشاپور سے فیروزہ اور بدخشاں سے یاقوت، علیٰ ہذا القیاس۔ اب جب تک یہ سب چیزیں جمع نہ ہولیں وہ انعام کیسے بھیج سکتا ہے۔ قطعے کے آخر میں تقاضا ہے۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ میرزا ہجو کرنا جانتے نہیں۔ ان کے کلیات میں تین چار مختصر ہجویں ہیں۔ لیکن جیسے ان کی مدح عام طور پر بے جا مبالغہ سے خالی ہے، اسی طرح ایک آدھ استثنا کو چھوڑ کر ان کی ہجو بھی فحش گوئی تک نہیں پہنچی۔ ایک دشمن نے ان کو نقصان پہنچانے میں کوئی کمی نہیں کی تھی، اسے مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں ؎

ہم چو تو ناقابلے، در صُلبِ آدم، دیدہ بود — زاں سبب ابلیسِ ملعون، سجدہ بر آدم نکرد

حاش للّٰہ بود نت، در صُلبِ آدم تہمت است — پیشِ ہر کس، گفتم ایں اندیشہ، باور ہم نکرد

یعنی چوں کہ تیرے جیسا ناشدنی صُلبِ آدم میں موجود تھا اس لئے شیطان نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا لیکن خدا نہ کرے، یہ آدم پر تہمت ہے کہ تو ان کے صُلب سے پیدا ہوا ہے۔ میں نے جس کسی سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا، اس نے بھی میری تائید کی اور اس بات کو باور نہیں کیا۔

محرقِ قاطع برہان کے مصنف منشی سعادت علی کی ہجو میں انھوں نے ایک رباعی کہی ہے؎ اسی طرح ایک فحش رباعی سبد چین کی پہلی اشاعت

؎ لطائف غیبی صہ ۱۵

میں تھی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ یہ کس کے خلاف کہی گئی تھی۔ (اسی فحش کی بنا پر میں نے اسے اشاعتِ ثانی سے حذف کر دیا تھا)

ظرافت میرزا اگر شاعری کا ذوق اور فارسی زبان سے مناسبت، ازل سے اپنے ساتھ لائے تھے تو ظرافت بھی گویا ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ان کی کوئی بات لطیفے اور چٹکلے سے خالی نہیں ہوتی تھی۔ غور سے دیکھا جائے تو ان کی زندگی کسی صورت میں بھی ایک خوش حال اور مطمئن زندگی نہیں کہی جا سکتی۔ ساری عمر ان کی مخالفت ہوتی رہی۔ شروع میں فنِ شعر میں "جدتوں اور بدعتوں" کی وجہ سے اور آخر میں قاطع برہان کی تصنیف کے باعث۔ بہادر شاہ کے دربار میں کیا کچھ گذری، یہ معلوم کرنے کے لئے ہمارے پاس کوئی یقینی ذریعہ نہیں، لیکن سہروں کے واقعے نے اس کے ایک گوشے سے بھی نقاب اُلٹ دی ہے۔ ان کے متعدد فارسی قطعوں سے معلوم ہوتا ہے کہ مخالف (یہ ذوق کے حلیف) ان کے اردو کلام پر اعتراض کرتے رہتے تھے۔ غرض یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے، کہ یہاں بھی ان کے خلاف ریشہ دوانیاں ہوتی رہتی تھیں۔ یہ تو رہا ذہنی پہلو۔ مادی لحاظ سے بھی نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فارغ البال تھے۔ یس یوں خوش و ناخوش، انھوں نے گذارنے کو تو گذار دی، لیکن صحیح بات یہ ہے کہ وہ اطمینان اور بے فکری، جو روح اور دل و دماغ کی غذا ہے، اور انسان کی مخفی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی، اور انھیں جلا دیتی ہے، انھیں بہت کم نصیب ہوئی۔ عمر بھر انھیں نہ تو ذہنی سکون میسّر ہوا، نہ مادی اطمینان۔ ایسے حالات کا لازمی نتیجہ افسردگی

اور دل گرفتگی ہوا کرتی ہے۔ اس لئے یہ واقعی تعجب کا مقام ہے، کہ ایسے داخلی اور خارجی ماحول میں بھی ان کی طبیعت کی شگفتگی مرتے دم تک قائم رہی اور ان ایام میں بھی جب وہ چاروں طرف سے ہر طرح کے آلام میں گھرے ہوئے تھے، انھوں نے کسی خاص کدورت کا اظہار نہیں کیا۔

مولانا حالی نے سچ فرمایا ہے کہ انھیں "حیوانِ ناطق" کی جگہ "حیوانِ ظریف" کہا جائے، تو بجا ہے ظرافت ان کی فطرت کا جزوِ اکبر تھا۔ چوں کہ دماغ نہایت تیزی سے کام کرتا تھا، اس لئے فوراً کچھ نہ کچھ سوجھ جاتی تھی، اور جب کوئی بات ذہن میں آجاتی، تو پھر وہ اسے کہنے سے رُک نہیں سکتے تھے، مخاطب خواہ کوئی ہو۔ وہ ظفر اور ناظم تک سے تو ٹلتے نہیں تھے اور کسی کا کیا ذکر ہے۔

گفتگو جانسن کا قول ہے کہ کامیاب بات چیت کرنے کے لئے سب سے اول علم کی ضرورت ہے جو گویا خام مادے کا حکم رکھتا ہے، جس سے یہ عمارت تیار ہوتی ہے۔ اس کے بعد صاحب گفتگو کو زبان کی مہارت اور الفاظ پر قدرت درکار ہے۔ تیسری چیز تخیل اور پروازِ فکر ہے تاکہ وہ معمولی سی بات کو بھی لے اُڑے اور اسے غیر معمولی طور پر پیش کر سکے اور سب سے آخر قوتِ ارادی اور مستقل مزاجی کہ وہ ناکامی سے گھبرانے کا نام نہ لے۔ جس شخص میں یہ چاروں صفتیں ہوں گی وہ کسی مجلس میں ہیٹا نہیں رہے گا۔

غالب میں ان چاروں خصوصیتوں کا بہرۂ وافر موجود ہے۔ علم، زبان پر قدرت، تخیل، استقلال کسی چیز کی ان کے ہاں کمی نہیں بلکہ فطری ظرافت ان

کے پاس ایک اضافی چیز ہے۔ اس سے ہم آسانی سے خیال کر سکتے ہیں، کہ وہ کیسے کامیاب "باتونی" رہے ہوں گے۔ افسوس کہ انھیں کوئی بوسویل نہ ملا جو ان کی تمام باتوں کو قلم بند کر لیتا۔ پھر بھی آزاد اور حالی کے ذریعے سے جو لطیفے ہم تک پہنچے ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس میدان کے بھی شہسوار تھے۔

یہاں ایک اور بات بھی لکھ دینا چاہیے، ظرافت اور مزاح کے عادی ہونے کی وجہ سے وہ بسا اوقات گفتگو میں کوئی ایسی بات کہہ جاتے ہیں جو درحقیقت ان کی اصلی رائے نہیں ہوتی۔ اگر اسی مسئلے سے متعلق ان کی تحقیقی رائے دریافت کی جائے، تو وہ کچھ اور کہیں گے۔ اس سے بعض اصحاب کو دھوکا ہوا ہے اور انھوں نے اسے ان کی "غلطی" یا "قوتِ فیصلہ کے فقدان" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تحقیق اور مزاح میں فرق ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر ان کا ایک لطیفہ لیجیے۔ کسی مجلس میں رتھ کی تذکیر و تانیث سے متعلق گفتگو ہوئی، تو انھوں نے لطیفہ چھانٹا کہ اگر اس میں عورتیں بیٹھی ہوں، تو مؤنث اور اگر مرد ہوں، تو مذکر۔ ظاہر ہے کہ یہ محض مذاق ہے اور اسے کوئی شخص مذاق سے زیادہ وقعت دے گا بھی نہیں۔ لیکن جب اسی بارے میں میر مہدی حسین مجروح نے ان سے دریافت کیا تو انھیں تحقیقی جواب دینا پڑا کہ رتھ میرے نزدیک مذکر ہے۔ اب اس پر اعتراض وہی کرے گا جس کی سنجیدگی مرض کی حد تک پہنچی ہوئی ہے یا جسے خواہ مخواہ اعتراض ہی کرنا منظور ہے۔ دراصل غیر سنجیدہ اور ہنگامی گفتگو کے موقع

پر موضوع کے صحیح یا غلط ہونے کا خیال نہیں ہوا کرتا بلکہ اس وقت گرمیٔ محفل اور اپنی قوتِ کلام اور حاضر جوابی کا اظہار مقصود ہوتا ہے، حالانکہ کہنے والے کی ذاتی رائے کچھ اور ہوتی ہے اور حاضرینِ مجلس بھی یہ جانتے ہیں۔

غرض کہ قرائن سے یہ حتمی طور پر ثابت ہے کہ میرزا ایک اچھے "باتونی" تھے۔

رشتہ داروں سے محبت

میرزا کا اپنا خاندان بہت مختصر تھا، لے دے کے ایک بھائی اور ایک بہن۔ بہن کی شادی بہت کم سنی میں ہو گئی اور وہ اپنے گھر بار والی ہو گئی تھیں۔ بھائی میرزا یوسف غالباً انھی کے ساتھ آگرے سے دہلی چلے آئے تھے یا شاید کچھ مدت بعد میں آئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے، کہ وہ شروع میں انھیں کے پاس مقیم بھی رہے ہوں۔ چوں کہ انھیں بھی ساڑھے سات سو سالانہ پنشن کے ملتے تھے، اس لئے بسر اوقات کے لئے انھیں کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ ان کی شادی فراش خانہ (دہلی) میں ایک مغلوں کے خاندان میں ہوئی تھی۔ اولاد میں صرف ایک صاحبزادی تھیں، جو میرزا علی بخش خاں کے صاحبزادے غلام فخر الدین سے منسوب تھیں۔

غالبؔ کو اپنے بھائی سے کس قدر محبت تھی، اس کا اندازہ ان کی کتنی تحریروں سے ہو سکتا ہے۔ ایک دفعہ جب وہ بیمار ہو گئے تو ان کے غسلِ صحت پر لکھا:

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

غدر کے زمانے میں وہ ان سے الگ مکان میں رہتے تھے۔ ان ایام میں میرزا ان سے متعلق بہت فکرمند اور مضطرب تھے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح انھیں اپنے پاس لے آئیں، لیکن حالات کچھ ایسے تھے کہ وہ اپنے ارادے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اسی دوران میں میرزا یوسف نے وفات پائی۔ اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے، انھوں نے دستنبو میں جن دردناک جذبات کا اظہار کیا ہے، اس سے صاف عیاں ہے کہ انھیں بھائی کی موت سے کتنا صدمہ ہوا۔ اسی طرح جہاں کہیں انھوں نے اپنے بھانجوں کا ذکر کیا ہے نہایت محبت سے۔ وہ ہمیشہ ان کی خیر و عافیت کے طلب گار رہے۔

پنشن کے معاملے میں انھیں نواب احمد بخش خاں اور ان کے جانشین شمس الدین احمد خاں دونوں سے جائز شکایت اور رنجش تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے نہایت عالی ظرفی کا ثبوت دیا اور ان واقعات کی ناخوش گوار یاد کو خاندان کے باقی افراد سے تعلقات کی راہ میں حائل نہیں ہونے دیا۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سسرال کا خاندان گویا ان کا اپنا خاندان بن گیا۔ بالخصوص امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں سے ان کے تعلقات بالکل برادرانہ تھے اور انھوں نے ساری عمر، نہایت وفاداری اور بے جگری سے ان دونوں بھائیوں اور ان کی اولاد کا دکھ سکھ میں ساتھ دیا۔ ضیاء الدین احمد خاں کی تو تعلیم و تربیت بھی بہت حد تک انھیں کے

ہاتھوں میں ہوئی۔ ان دونوں کے علاوہ، اس خاندان کے اکثر دوسرے نوجوان بھی ان کے شاگرد اور تربیت یافتہ تھے۔[1] یہ سب بھی ان کا حد درجہ ادب کرتے تھے اور ان کی حیثیت کسی طرح خاندان کے بزرگ سے کم نہیں تھی۔

بچوں سے محبت

میرزا کا اپنا کوئی بچہ زندہ نہیں رہا۔ عارف کی وفات پر امراؤ بیگم ان کے چھوٹے لڑکے حسین علی خاں کو اپنے ہاں لے آئیں، جس کی عمر اس وقت صرف دو برس کی تھی۔ تھوڑے دن بعد باقر علی خاں بھی پانچ برس کی عمر میں انھیں کے پاس آ گئے۔ ان بے ماں باپ کے دونوں بچوں کی پرورش جس محبت اور دل سوزی سے انھوں نے کی وہ کچھ انھی سے ممکن تھی۔ دونوں بچے انھیں بہت دق کرتے تھے۔ تفتہ کو لکھتے ہیں۔[2]

"سنو صاحب، یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا اور اب اس کے دونوں بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں، میرے پاس آ رہے ہیں اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں اور میں تحمل کرتا ہوں خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمھارے

---

[1] اس خاندان میں ان کے مندرجہ ذیل شاگرد تھے: نیر رخشاں۔ علائی۔ ثاقب۔ طالب۔ مجروح۔ عارف۔ شاداں۔

[2] اردوے معلیٰ صفحہ ۵۵-۵۶، خطوط غالب (۱ = ۸-۹)

نتائج طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب ان عالم صورت کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ مجھ کو دوپہر کو سونے نہیں دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں، کہیں خاک اُڑاتے ہیں، میں تنگ نہیں آتا، تو ان معنوی پوتوں سے، کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں، کیوں گھبراؤں گا؟"

الغرض ان کے ہر طرح کے لاڈ چاؤ برداشت کرتے۔ ان کے آرام کے لئے آپ تکلیف اُٹھاتے، لیکن ماتھے پر بل نہ لاتے۔ بڑھاپے میں انھیں گلے کا ہار بنائے بنائے پھرتے تھے۔ جہاں جاتے وہ پالکی میں ساتھ ہوتے۔ رام پور کے دونوں سفروں میں بھی وہ ساتھ تھے۔ ان کی تفریح کے لئے ہر طرح کا سامان مہیا رہتا۔ میرزا کی ہمیشہ یہ کوشش رہتی کہ ان کی دل چسپی اور دل بستگی میں کوئی کمی نہ رہنے پائے۔ دو دو روپے مہینہ انھیں جیب خرچ ملتا تھا۔ رام پور سے ایک خط میں تحریر کرتے ہیں[ے]:

"لڑکے دونوں اچھی طرح ہیں۔ کبھی میرا دل بہلاتے ہیں، کبھی مجھ کو ستاتے ہیں۔ بکریاں، کبوتر، بٹیریں، ہنکل، کنکوا، سب سامان درست ہے۔ فروری مہینے کے دو دو روپے لے کر دس دن میں اُٹھا ڈالے۔ پھر پرسوں چھوٹے صاحب آئے کہ دادا جان کچھ ہم کو قرض حسنہ دو۔ ایک روپیہ دونوں کو قرض حسنہ دیا گیا۔ آج ۱۳ ہے، مہینا دو رہے، دیکھیے کے بار قرض لیں گے۔"

ے اردوئے معلیٰ حصہ ۱، مخطوطات غالب ۱، ۲۶ (بنام حکیم غلام نجف خاں)

چھوٹے صاحب کی یہ فضول خرچی کی عادت اخیر تک ان کے ساتھ رہی میرزا ان کی اسی عادت کے سبب انھیں "لڑکے بادشاہ" کہہ کر پکارا کرتے تھے کہ میاں بادشاہوں کے سے اللّے تللّے کرتے ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ چوں کہ خود "طفلی" میں یتیم رہ گئے تھے، اس لئے "دردِ طفلاں" کی حقیقت سے خوب واقف تھے اور جانتے تھے کہ یتیمی کا داغ کیا معنی رکھتا ہے اور بچوں کی حسرتیں کیا ہوا کرتی ہیں۔

باقر علی خاں، ان کی زندگی ہی میں گھر بار والے ہو گئے تھے اور ان کی وفات کے وقت اُن کی دو صاحبزادیاں موجود تھیں۔ بڑی لڑکی محمد سلطان بیگم سے میرزا کو بہت محبت تھی۔ میرزا کی وفات کے وقت یہ چار برس کی تھیں۔ اس زمانے میں بھی جب باقر علی خاں علیحدہ مکان میں اُٹھ گئے تھے، یہ دن بھر انھیں کے پاس کھیلتی رہتی تھیں۔ اسی طرح نواب علاء الدین احمد خاں کے صاحبزادے فرخ میرزا اور حکیم غلام نجف خاں کے صاحبزادے ظہیر الدین کے نام ان کے خطوط موجود ہیں جن سے ان کے جذباتِ محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

لیکن یہ تو پھر بھی ان کے اپنے "بچے" تھے۔ انھیں دوسروں کے بچوں سے بھی ایسی ہی محبت اور شیفتگی تھی اور وہ سب دوستوں کی اولاد کا حال پوچھتے رہتے تھے۔ منشی نبی بخش حقیر کے نام کے خطوں سے ان کی صاحبزادی زکیہ بیگم اور ان کے بیٹوں اور پوتوں سے غایت درجہ محبت اور شغف کا ثبوت ملتا ہے۔ کوئی خط ان کے ذکر سے خالی نہیں۔ ہر خط میں ان کی صحت اور تعلیم و تربیت اور عام حالات سے متعلق پوچھتے ہیں اور اگر حقیر لکھنا بھول

جاتے ہیں تو ان پر خفا ہوتے ہیں۔

دوستوں سے محبت

دوستوں سے وفا اور ان پر جان چھڑکنا ان کا ایمان تھا۔ وہ یوں بھی حساس طبیعت کے تھے لیکن ان کی اپنی مصیبت ناک زندگی، اور اس پر ۱۸۵۷ء کی ناگہانی افتاد نے انھیں پکا پھوڑا بنا دیا تھا۔ جہاں کسی دوست کے پھانس بھی چبھتی، یہ بلبلا اُٹھتے۔ اپنی وسعت کے مطابق جو کچھ ہو سکتا اس سے دریغ نہ کرتے۔ اگر خود کچھ نہ کر پاتے تو دوسروں سے سفارش کرتے۔ اگرچہ ان کا اپنا حال بھی کبھی آسودہ نہیں ہوا لیکن یہ "گدائے غنی دل" کسی دوست اور عزیز کی تکلیف نہیں دیکھ سکتا تھا۔

انھوں نے امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں کا ساتھ جس پامردی سے دیا وہ ان کی زندگی کا درخشاں واقعہ ہے۔ نواب احمد بخش خاں کی وفات کے بعد ان کی پنشن، نواب شمس الدین احمد خاں سے متعلق ہو گئی تھی۔ اگر میرزا ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تو نہ صرف یہ پنشن ہی باقاعدہ ملتی رہتی، بلکہ یقین ہے کہ نواب احمد بخش خاں کے زمانے کی فتوحات بھی جاری رہتیں۔ رشتہ بھی برابر کا تھا اور کوئی ترجیح کی وجہ نہیں تھی لیکن محض حق پرستی اور وفا کے احساس نے انھیں شمس الدین احمد خاں کے خلاف ہونے پر مجبور کر دیا۔ جانی اور مالی نقصان کے قوی امکان کے باوجود انھوں نے ان دونوں بھائیوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ آخر کار ان کے اس مخالفانہ رویے سے ناراض ہو کر شمس الدین احمد خاں نے ان کا وظیفہ بند کر دیا۔ لیکن یہ وار بھی خالی گیا اور

وہ اپنی روش پر مضبوطی سے قائم رہے۔ انھوں نے حصولِ ریاست میں امین الدین احمد خاں کی ہر طرح مدد کی، اور جب ۱۸۳۴ء میں وہ اسی سلسلے میں سپریم کونسل کے سامنے اپیل کرنے کے لئے کلکتہ تشریف لے گئے، تو میرزا نے اپنے کلکتہ کے احباب کے نام خط لکھے کہ حتی الامکان ان کی امداد میں کمی نہ کی جائے۔ خدا نے بھی ان کوششوں کو پروان چڑھایا اور لوہارو انھیں دوبارہ مل گیا۔

دہلی میں افواہ اڑی کہ راجہ بھرت پور وفات پا گئے۔ انھیں فوراً اپنے دوستوں کی فکر ہوئی، جو اس سرکار سے وابستہ تھے۔ دیکھئے کس اضطراب سے تفتہ کو لکھتے ہیں:[1]

"بھائی، آج مجھ کو بڑی تشویش ہے اور یہ خط میں تم کو کمال سراسیمگی میں لکھتا ہوں۔ جس دن میرا خط پہنچے، اگر وقت ڈاک کا ہو، تو اسی وقت جواب لکھ کر روانہ کرو۔ اور اگر وقت نہ رہا ہو تو چار و ناچار دوسرے دن جواب بھیجو۔ منشا تشویش و اضطراب کا یہ ہے کہ کئی دن سے راجہ بھرت پور کی بیماری کی خبر سُنی جاتی تھی۔ کل سے اور بُری خبر شہر میں مشہور ہے۔ تم بھرت پور سے قریب ہو۔ یقین ہے کہ تم کو تحقیق حال معلوم ہوگا۔ جلد لکھو کہ کیا صورت ہے۔ راجہ کا مجھ کو غم نہیں۔ مجھ کو فکر جانی جی کی ہے کہ اسی علاقہ

---

[1] اردوئے معلی صفحہ ۴۲-۵۰ ، خطوط غالب (۱۰۱-۱۰۲)

میں تم بھی شامل ہو...... واسطے خدا کے نہ مختصر، نہ سرسری، بلکہ مفصّل اور مُنقّح، جو کچھ واقع ہوا ہو اور جو صورت ہو، مجھ کو لکھو اور جلد لکھو، کہ مجھ پر خواب و خور حرام ہے۔ کل شام کو میں نے سُنا، آج صبح قلعے نہیں گیا اور یہ خط لکھ کر ازرہِ احتیاط بیرنگ روانہ کیا ہے۔ تم بھی اس کا جواب بیرنگ روانہ کرنا..... زیادہ کیا لکھوں، کہ پریشان ہوں۔"

اور ان کی سب دوستوں سے محبّت کا یہی حال تھا۔ متعدد مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کی ضرورت نہیں۔ انھیں اپنی بے چارگی کا احساس ایسے موقع پر اور شدید ہو جاتا جب وہ کسی دوست کو تکلیف میں دیکھتے اور اس کی مدد نہ کر سکتے۔ میر مہدی مجروحؔ کو لکھتے ہیں[1]:-

"اے میر مہدی، تو درماندہ و عاجز پانی پت میں پڑا رہے۔ میرن صاحب وہاں پڑے ہوئے دلّی دیکھنے کو ترسا کریں۔ سرفراز حسین نوکری ڈھونڈتا پھرے اور میں ان غم ہائے جاں گداز کی تاب لاؤں۔ مقدور ہوتا تو دکھا دیتا کہ میں نے کیا کیا ع

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ۔ اللہ، اللہ، اللہ"

یوسف میرزا کو لکھتے ہیں[2]:-

"یہاں اغنیا و امرا کے ازواج و اولاد بھیک مانگتے پھریں اور

---

[1] اردوئے معلیٰ صہ ۱۱۸، خطوطِ غالب (۱ = ۲۶۵)

[2] اردوئے معلیٰ صہ ۲۵۵، خطوطِ غالب (۱ = ۱۶۲)

میں دیکھوں۔ بس مصیبت کی تاب لانے کو جگر چاہیے۔"

ایک اور مقام پر انھوں نے جو کچھ نواب علاء الدین احمد خاں کو لکھا ہے، ہاں گویا اپنی تمام حسرتوں کو زبانِ قلم سے بیان کر دیا ہے۔[۵]

"مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے اپنی نظم و نثر کی داد باندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیے ہیں، بقدر ہزار، ایک ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ ایک لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکاؤں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھیرا، کبھی نجف جا پہنچا۔ نہ وہ دستگاہ، کہ ایک عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے نہ سہی، جس شہر میں رہوں، اس شہر میں تو بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔ .... وہ جو کسی کو بھیک مانگتے نہ دیکھ سکے اور خود در بدر بھیک مانگے، وہ میں ہوں۔"

شاگردوں سے محبّت

شعر و سخن میں اُستادی شاگردی کی رسم فارسی کے سوائے اور کسی زبان میں نہیں ملتی۔ اردو نے جہاں اور کتنی چیزیں، اچھی اور بُری، فارسی سے لیں، اسی طرح یہ رسم بھی اپنالی۔ اس میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ اگر اسے ایک حد کے اندر،

---

[۵] اردوئے معلّیٰ صہ ۲۹۳-۲۹۴، خطوط غالب (ا = ۲۶۳-۲۶۴)

اعتدال سے استعمال کیا جائے، تو یہ شاگرد کی ترقی و تہذیب میں مفید ہو سکتی ہے لیکن اگر اس میں بے اعتدالی آجائے، تو شاگرد ہمیشہ کے لئے عطائی ہو کے رہ جاتا ہے اور کبھی اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہو سکتا۔

میرزا نے اگرچہ اپنے کلام پر کسی سے اصلاح نہیں لی اور اس لحاظ سے ان کی تمام ترقی "خدائے بخشندہ" کی بخشایش اور ان کے اپنے "زورِ بازو" کا نتیجہ سمجھنا چاہیے لیکن انھوں نے ابتدائی درسی تعلیم مولوی محمد معظم سے حاصل کی اور اس کی تکمیل ملا عبدالصمد ایرانی سے کی۔ ملا عبدالصمد کی مشفقانہ تعلیم کی یاد انھیں آخر دم تک رہی۔ ان کی تصنیفات میں جہاں کہیں ان کا نام آگیا ہے، نہایت ادب اور محبت سے ان کی فضیلت اور علمیت اور تربیت کا ذکر کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے شاگردوں کے کلام کی اصلاح اور انھیں حتی الوسع شاعری اور زبان کے رموز و نکات سمجھانے میں بھی کوتاہی نہیں کی۔

اصلاح سے متعلق ان کے چند مقررہ اصول تھے اور وہ ان پر سختی سے کاربند تھے۔ تمام شاگردوں کو ان باتوں کی پابندی کرنا پڑتی تھی اور اس بارے میں وہ کسی کی رو رعایت نہیں کرتے تھے۔

جو کلام ان کے پاس اصلاح کے لئے آتا تھا، اس میں شعروں اور مصرعوں کے درمیان اتنی جگہ چھوڑی جاتی تھی کہ اصلاحی الفاظ آسانی سے لکھے جا سکیں۔

تحریر صاف، روشن اور خوش خط اور دبیز کاغذ پر ہوا کرتی تھی۔ مقصود یہ تھا کہ نہ انھیں خود اصل مسودہ پڑھنے میں دقت ہو، نہ ان کی اصلاح مغشوش ہو جائے، جسے شاگرد کے لیے سمجھنا مشکل ہو۔

وہ اصلاح کے ساتھ وجہ اصلاح بھی لکھتے جاتے تھے تاکہ شاگرد آئندہ کے لیے، اپنی رہنمائی آپ کر سکے۔ اگر شاگرد ان کے یہ اشارات غور سے نہیں دیکھتا تھا تو وہ اس پر خفا ہوتے تھے کیوں کہ اس کا یہ مطلب تھا کہ ان کی محنت رائیگاں جا رہی ہے۔ ان کا مزاج کسی حد تک جھلّا تھا۔ وہ بہت زود رنج تھے اور بحث کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ شاگرد کے سوال کرنے سے نہیں گھبراتے تھے بلکہ اس سے خوش ہوتے کیوں کہ یہ ظاہر کرتا تھا کہ شاگرد ان کی ہدایتوں کا غور سے مطالعہ کر رہا اور خود اپنی فہم و فراست سے بھی کام لے رہا ہے۔ لیکن ایسی تکرار جو کٹ حجتی یا ہٹ دھرمی کا پہلو لیے ہوتی، انھیں بہت ناگوار گذرتی تھی۔

اصلاح میں ان کا اصول یہ تھا کہ اگر تبدیلی سے کلام میں واقعی ترقی ہوتی ہے تو بہتر، ورنہ لفظ کی جگہ ہم معنی لفظ لکھ دینے سے وہ پرہیز کرتے تھے، کہ اس سے محض اپنی قدرتِ کلام کا اظہار ہوتا ہے۔ نہ شاگرد ہی کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے نہ کلام کے درجے ہی میں کوئی فرق پیدا ہوتا ہے۔ ان کی اصلاح اس حد تک نہیں جاتی کہ شاگرد کا مضمون ہی سرے سے بدل جائے۔ وہ املا یا محاورے یا زبان کی غلطی کی اصلاح کر دیتے ہیں یا کسی جگہ لفظ تبدیل کیا ہے تو ایسا کہ اس سے شعر بلند ہو گیا ہے اس سے شاگرد کی طرز میں انفرادیت

اور خصوصیت پیدا ہو جاتی ہے لیکن اگر اُستاد اپنی طرف سے اتنا تصرف کرنا شروع کر دے، کہ شاگرد کا اصل مطلب ہی غت ربود ہو جائے تو یہ تو ممکن ہے کہ اس سے شعر غیر معمولی طور پر بلند ہو جائے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ کسی طرح اس کا کلام نہیں کہلا سکتا۔

جو شعر انھیں پسند آتا اس پر صاد کر دیتے اور تعریفی کلمات لکھنے میں بخل سے کام نہ لیتے۔ اس سے شاگرد کا دل بڑھتا اور اسے معلوم ہوتا، کہ میں ترقی کر رہا ہوں۔ اُستاد عام طور پر ایک آدھ شعر اپنی طرف سے بھی کہہ کر شاگرد کو عطا کر دیتے ہیں۔ میرزا کی بھی اپنے شاگردوں کو شعر دینے کی مثالیں ملتی ہیں، لیکن بہت کم۔ وجہ یہ ہے کہ ایک تو یہ شاگرد کے وقار اور خودداری کے خلاف ہے، کہ وہ دوسرے کے کلام کو اپنے نام سے پیش کرے، دوسرے بھلا اس سے شاگرد کو کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

میرزا کے شاگردوں میں ہر طبقے کے لوگ موجود تھے۔ ناظم اور بیتاب اور توفیق جیسے والیانِ ریاست اور شہزادے بھی اور ذکا اور قدر اور تفتہ جیسے ملازمت پیشہ صاحبان بھی۔ شیفتہ اور عرشی اور حقیر جیسے عالم فاضل بزرگ بھی اور مونس اور درد اور آرام جیسے معمولی پڑھے لکھے لوگ بھی۔ لیکن وہ سب سے یکساں مہربانی اور لطف سے پیش آتے۔ ہر ایک کے کلام پر توجہ اور محنت سے اصلاح دی جاتی۔ اگر بیماری یا کسی اور سبب سے اصلاح کا کام رُک جاتا، تو سب کے مسودے پڑے رہتے۔

ان کا اپنے شاگردوں سے تعلق، ان کے کلام پر اصلاح دینے ہی تک محدود نہیں تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ شاگردوں کو اپنے دوسرے دوستوں اور عزیزوں سے کم نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ان کی ہر طرح کی بہتری اور بہبودی کے خواہاں رہتے۔ ان کے روزگار میں ترقی کے لئے دامے، درمے، قدمے، تمام کوشش کرتے۔ مثلاً یوسف علی خاں عزیز ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں بے کار ہو گئے۔ چھوٹے چھوٹے بال بچے اور بے روزگاری، زندگی دو بھر ہو گئی۔ میرزا نے مختلف دوستوں کو سفارشی چٹھیاں لکھیں کہ کسی طرح ان کے لیے، کوئی سبیل نکل آئے، لیکن اسی پر اکتفا نہیں کی بلکہ بے کاری کے زمانے میں اپنے مقدور بھر ان کا درماہہ مقرر کر دیا۔ اسی طرح غلام حسنین قدر بلگرامی کی سفارشیں کرتے رہے۔ تفتہ اور مجروح کے لئے بھی صاحبِ اثر دوستوں کو لکھتے رہے۔

یہی باتیں تھیں جن کے باعث ان کے شاگرد بھی ان سے اتنی محبت کرتے تھے اور ان کی مشکلوں میں ان کے لئے کسی قسم کی قربانی کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔

اساتذہ کا ادب

میرزا کی خود پسندی اور تعلّی کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ ہندستان کے فارسی دانوں کا تو ذکر ہی کیا کہ وہ انھیں اس قابل بھی خیال نہیں کرتے کہ ان کا نام بھی لیا جائے، وہ اپنے آپ کو اکابر اہلِ ایران میں سے بھی کسی سے کم تر نہیں سمجھتے تھے۔ لکھتے ہیں:[۱]

---

[۱] اردوئے معلی صفحہ ۳۶۰-۳۶۱ مخطوط غالب (۱۸۴۸ء) (بنام ہرگوپال تفتہ)

"اہلِ پارس میں اور مجھ میں دو طرح کے تفاوت ہیں۔ ایک تو یہ کہ
ان کا مولد ایران اور میرا مولد ہندستان۔ دوسرے یہ کہ وہ لوگ
آگے پیچھے سَو، دو سَو، چار سَو، آٹھ سَو برس پہلے پیدا ہوئے
ہیں۔"

لیکن جہاں تک زبان کے قواعد و ضوابط اور اس کی نزاکتوں کا تعلق ہے، وہ ان باتوں کے علم میں کسی کی برتری تسلیم نہیں کرتے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں "میرے ضمیر میں اس طرح جاگزیں ہیں جیسے فولاد میں جوہر"۔ بلکہ پرانے اساتذہ کے پہلے گذرنے سے انھوں نے ایک اور لطیف مضمون پیدا کیا ہے ؎

باخذِ فیض ز مبداء فزونم از اسلاف | کہ بودہ ام قدرے دیر تر بداں درگاہ
نزولِ من بجہاں بعدِ یک ہزار و دو بیست | ظہورِ خسرو و سعدی بہ شش صد و پنجاہ

یعنی میں اگر اتنی دیر بعد پیدا ہوا ہوں، تو یہ میرے لئے فخر و عزت کا مقام ہے، کیوں کہ اسی نسبت سے مجھے مبداءِ فیاض سے اتنی مدت زیادہ استفادہ کرنے کا موقع ملا اور میری استعداد و قابلیت بھی اسی قدر زیادہ ہے۔ اسی تفاخر کا نتیجہ تھا جو کلیاتِ فارسی کے دیباچہ میں انھوں نے اساتذۂ قدیم کو چراغ سے اور اپنے آپ کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے۔

لیکن اس کے باوجود وہ حفظِ مراتب کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ سید احمد حسن فنا مودودی نے غزل لکھی۔ انھی قافیوں میں دوسری ردیف کے ساتھ شہیدی کی غزل موجود تھی۔ میرزا نے اصلاح دیئے بغیر غزل انھیں واپس

بھیج دی اور لکھا:- [1]

"غزل کا کاغذ واپس بھیجتا ہوں۔ نہ اس کو پھاڑ سکوں، نہ پانی میں دھو سکوں۔ شہیدی کی غزل ان قافیوں میں بہ تغیر ردیف ایسی ہے کہ اب ان قافیوں کا باندھنا ہرگز نہ چاہیے۔ آپ اور غزل لکھیے، اس کو ہرگز دیوان میں نہ رکھیے۔"

نواب علاء الدین احمد خاں نے ان سے "مژگاں گلہ دارد، ارماں گلہ دارد" کی زمین میں غزل لکھنے کی فرمائش کی۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ زمین قدسی کے حصے میں آ چکی ہے۔ میں ان قافیوں میں لکھ کر "بے حیائی" کا مرتکب نہیں ہونا چاہتا۔ [2]

بادی النظر میں اس سے ان کے کردار کا تضاد نظر آتا ہے، کہ ایک طرف تو وہ اساتذۂ سلف سے ہم سری بلکہ ان پر فوقیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور دوسری طرف بعض اوقات ان کے تتبع میں لکھنے سے گریز بھی کرتے ہیں۔ لیکن غور سے دیکھا جائے، تو اصل میں کوئی تضاد نہیں، بلکہ یہی بات ان کی انصاف پروری اور بلند نظری کی بین دلیل ہے۔

انھوں نے مشہور شاعروں کی زمینوں میں قصیدے اور غزلیں لکھی ہیں اور کبھی کبھی وہ اپنے پیش رووں پر چشمک بھی کر جاتے ہیں، لیکن جہاں دیکھتے

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۱۸۳

[2] ایضاً صفحہ ۳۱۱، خطوط غالب (۱ : ۲۴۲)

ہیں، کہ کسی شخص کا کلام واقعی اتنا بلند اور قابلِ تعریف ہے، کہ اس کا جواب نہیں ہو سکتا، تو وہ فوراً اس کا اقرار کر لیتے ہیں، جو انصاف کا تقاضا ہے۔ کونسی زمین یا طرح ایسی ہے، جس میں چند شعر نہ کہے جا سکیں لیکن میرزا کے نزدیک یہی کافی نہیں، کہ شعر لکھ لیے جائیں، بلکہ یہ کہ وہ اچھے بھی ہوں اور اگر اسی زمین میں پہلے سے کسی کا کلام موجود ہے، تو اس کے مقابلے میں رکھنے کے قابل ہوں۔ اگر یہ ممکن نہیں، تو جھک مارنے سے فائدہ بہتر ہے کہ اپنے عجز کا اعتراف کر لیا جائے۔ مثلاً انھوں نے جب نظیری کی زمین میں غزل لکھی اور نظیری کو وہ اُستاد مانتے تھے تو دیکھیے مقطع میں کس شوخ پیرایہ میں داد طلب کی ہے ؂

جوابِ خواجہ نظیری، نوشتہ ام غالب
خطا نمودہ ام و چشمِ آفریں دارم

یہاں ضمناً ایک اور بات پر بھی روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ میرزا غالب، ہندوستان کے فارسی دانوں ۔ شاعروں اور ادیبوں ۔۔۔ میں سے کسی کو قابلِ استناد نہیں مانتے تھے اور انھوں نے اپنے خطوں اور تحریروں میں ان سب کو کوسا ہے۔ لیکن اس بات کے سمجھنے میں اکثر حضرات کو غلط فہمی ہوئی ہے کہ آخر ان کے اعتراض کی نوعیت کیا تھی۔ کیا ان کے خیال میں یہ اصحاب فارسی نہیں جانتے تھے یا جانتے تو تھے لیکن غلط زبان لکھتے تھے۔ یعنی آخر وہ کیا بات ہے جس پر انھیں اعتراض تھا۔

ہندستان کے فارسی لکھنے والوں میں بعض نام بہت مشہور ہیں حضرت امیر خسرو دہلوی۔ ابو الفیض فیضی۔ میرزا عبد القادر بیدل۔ ناصر علی علی۔ ان میں سے صف اوّل کے لوگ ہیں۔ مولوی غیاث الدین عزت رامپوری۔ مرزا محمد حسن قتیل دہلوی۔ احسان اللہ ممتاز۔ عبد الواسع ہانسوی۔ ملا محمد اکرم غنیمت کنجاہی۔ نور العین واقف بٹالوی۔ (ثم لاہوری) وغیرہ اگرچہ ان کے پائے کے نہیں لیکن پھر بھی ہندستانی فارسی نویسوں میں بہت مشہور و معروف ہیں۔ ان میں سے میرزا ایک حضرت امیر خسرو کے سوائے کسی کو نہیں مانتے۔ ان سب کا نام ان کے رقعات میں آیا ہے، اور انھوں نے ہر جگہ یہی لکھا ہے کہ یہ لوگ اس قابل نہیں، کہ ان کی فارسی کو معیاری سمجھا جائے۔ آخر کیوں؟ اس سوال کا جواب دینے سے پہلے میں چند بنیادی اصول بیان کرنا چاہتا ہوں۔

زبان ان علوم میں سے ہے جو سماعت پر مبنی ہیں۔ یہاں قیاس سے کام نہیں چلتا۔ میں نے جو پہلوں سے سُنا، وہ آج لکھ اور بول رہا ہوں۔ جو لوگ مجھ سے پہلے تھے، انھوں نے اپنے بڑوں کی پیروی کی، اور جو میرے بعد آئیں گے، وہ اپنے بڑوں کی تقلید کریں گے۔ یہاں چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا، کہ کوئی شخص جمہور کی رائے کے خلاف نئے الفاظ اور نئے محاورے گڑھنا اور لکھنا شروع کر دے جب تک ان کو قبولِ عام اور تائیدِ جمہور کی سند نہ مل جائے، وہ ٹکسال باہر ہیں، اور زبان کا جزو نہیں سمجھے جا سکتے۔ انھیں یہ مقبولیت اور تائید جبھی ملے گی، اگر وہ سماعی اصول پر

پورے اُتریں گے اور انھیں زبان میں داخل کرنے کا حق بھی صرف اس مُلک کے باشندوں کو حاصل ہے، جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے، نہ کہ کسی اجنبی کو۔ غرض کہ یہ کلیہ بہرحال قائم رہے گا کہ زبان سماعی علم ہے قیاسی نہیں۔ یہ پہلا اصول ہے۔

جس ملک میں کوئی خاص زبان بولی جاتی ہے، وہ اس مُلک کے باشندوں کی مادری زبان کہلاتی ہے اور وہ لوگ اہلِ زبان کہلاتے ہیں۔ چوں کہ وہ گہوارے سے اپنے اِردگرد کے بڑے بوڑھوں سے یہ زبان سنتے چلے آئے ہیں، اس لیے جیسے وہ، اس زبان کے اسرار و رموز سے واقف ہوتے ہیں، ایسے کسی دوسرے ملک کا باشندہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو ممکن ہے، کہ کوئی اجنبی محنت اور مشق سے اس زبان کے قواعد پر عبور حاصل کر لے، اور ان قواعد کی رو سے، اسے صحیح لکھ بھی لے۔ لیکن اس کے باوجود اس کا درجہ زباندان کا ہے، اہلِ زبان کا نہیں۔ کیوں کہ زبان پہلے بنتی ہے اور قواعد بعد میں۔ زبان اور بیان کے روزمرے میں سینکڑوں انوٹھیں اور نزاکتیں ایسی ہیں جو تحریر میں آسکتی ہیں نہ کسی قاعدے کی پابند ہوتی ہیں۔ ان کا تعلق سماعت اور وجدان سے ہے۔ یہ باتیں اس اجنبی کو کسی قاعدے اور کتاب میں نہیں ملیں گی اور اس حد تک اس کا علم ناقص رہے گا۔ یہ دوسرا اصول ہے۔

یہ اجنبی جس نے وہ زبان کتابوں کی مدد سے حاصل کی ہے، جب کوئی چیز اس زبان میں لکھے گا تو قدرتاً اس کی تحریر میں وہ سادگی اور آمد

بے ساختگی اور شیریں نہیں ہوگی، جو آپ کو کسی اہلِ زبان کی تحریر میں ملے گی۔ وجہ ظاہر ہے۔ چوں کہ اس نے اُسے مکتب میں پڑھا ہے اس لئے اس کا علم خارجی ہے، داخلی نہیں جیسے اس شخص کا، جس نے جب سے ہوش سنبھالا، یہی زبان سُنی اور بولی۔ اس کے لئے یہ زبان ایسی ہے جیسے "فولاد میں جوہر" یا "تار میں سُر"۔ اُسے لفظوں کی تلاش میں کاوش نہیں کرنا پڑتی۔ اس کے برعکس زبان دان کو اپنا ما فی الضمیر بیان کرنے میں الفاظ ڈھونڈنا پڑیں گے۔ اس سے خواہی نخواہی اس کے بیان میں تصنع اور آورد آجائے گی۔ یہ تیسرا اصول ہے۔

ان پیش کردہ اصولوں ہی سے ایک اور اصول پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی لفظ یا محاورے کی غلطی یا درستی میں بحث ہو تو اس کا فیصلہ اہلِ زبان کی سند سے ہوگا۔ اس بارے میں کسی بڑے سے بڑے اجنبی کا کلام بھی مفید مطلب نہیں ہو سکتا۔ یہ چوتھا اور آخری اصول ہے۔

اگر ہم یہ چاروں اصول اپنے سامنے رکھیں، تو ہم آسانی سے یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ غالبؔ کو ان ہندستانی فارسی لکھنے والوں پر اعتراض کیا ہے۔

غالبؔ اس سے انکار نہیں کرتے کہ یہ اصحاب عالم ہیں، فارسی جانتے اور لکھتے ہیں۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ ان کا اہلِ زبان سے کیا مقابلہ۔ حضرت صاحب عالم مارہروی کو لکھتے ہیں:۔

"ہندستان کے سخنوروں میں حضرت امیر خسرو دہلوی علیہ الرحمۃ

کے سوا کوئی استاد مسلم الثبوت نہیں ہوا خسرو کہ خسروِ قلمروِ سخن طرازی ہے یا ہم چشم نظامی گنجوی و ہم طرحِ سعدی شیرازی ہے۔ خیر فیضی بھی نغز گوئی میں مشہور ہے۔ کلام اس کا پسندیدۂ جمہور ہے۔ دیکھو عبدالقادر بدایونی کیا لکھتا ہے :۔ زہے سپاہی فالیز۔ آرزو، فقیر اور شیدا اور بہار وغیرہم انھیں میں آ گئے۔ ناصر علی اور بیدل اور غنیمت، ان کی فارسی کیا، ہر ایک کا کلام بنظرِ انصاف دیکھیے۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ منت اور مکین اور واقف اور قتیل۔ یہ تو اس قابل بھی نہیں، کہ ان کا نام لیجیے۔ ان حضرات میں عالم علومِ عربیہ کے شخص ہیں۔ خیر ہوں، فاضل کہلائیں۔ کلام میں ان کے مزا کہاں۔ ایرانیوں کی سی ادا کہاں۔ فارسی کی قاعدہ دانی میں اگر کلام ہے، تو اس میں پیرویٔ قیاس ایک بلائے عام ہے۔ وارستہ سیالکوٹی نے خان آرزو کی تحقیق پر سو جگہ اعتراض کیا ہے، اور ہر اعتراض بجا ہے۔ بایں ہمہ وہ بھی جہاں اپنے قیاس پر جاتا ہے، منہ کی کھاتا ہے۔ مولوی احسان اللہ ممتاز کو صنائع لفظی میں دستگاہ اچھی تھی، اس شیوہ و روش کو خوب برت گئے، فارسی وہ کیا جانیں۔ قاضی محمد صادق اختر، عالم ہوں گے، شاعری سے ان کو کیا علاقہ۔“

یہاں انھوں نے جامعیت سے سب مشہور ہندستانی فارسی نویسوں پر تبصرہ کر دیا ہے اور اسی سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیوں انھیں سند نہیں مانتے۔

صحیح زبان لکھ لینا اور بات ہے اور طرزِ گفتار کا اہلِ زبان کا سا ہو جانا اور بات ہے۔ اسی لئے وہ کہتے ہیں[1] کہ

"یہ لوگ راہِ سخن کے غول ہیں، آدمی کے گمراہ کرنے والے، یہ فارسی کو کیا جانیں۔ ہاں طبع موزوں رکھتے تھے، شعر کہتے تھے۔"

یعنی شعر لکھ لینا کچھ مشکل نہیں لیکن زبان کا سند ہونا اور اس میں اہلِ زبان کی سی گھلاوٹ ہونا اور بات ہے۔ اس میں کوئی قیاس اور کوشش مفید نہیں ہو سکتی۔ اہلِ زبان کی نقل کی کوشش کرنا ان کا منہ چڑانا ہے۔ اسی لئے وہ ایک جگہ قتیل پر اعتراض کرتے ہیں کہ "وہ ایرانیوں کی تقریر کے موافق تحریر بناتا ہے۔"

اس کی وضاحت ان کے ایک دوسرے خط سے بھی ہوتی ہے،
نواب انور الدولہ بہادر شفق میرزا کے شاگرد تھے۔ انھوں نے ایک قصیدہ لکھا اور اصلاح کے لئے ان کے پاس بھیجا۔ انھیں لکھتے ہیں[2]:-

"قصیدہ کو بار بار دیکھا اور غور کی۔ جس طرز پر ہے، اس میں گنجائش اصلاح کی نہ پائی، یعنی لفظ کی جگہ لفظ مرادف بالمعنی لانا صرف اپنی دستگاہ کا اظہار ہے۔ ورنہ کوئی لفظ بے محل اور بے موقع نہیں، یہ کوئی ترکیب فارسی ٹکسال سے باہر نہیں۔ مگر ہاں، طرزِ گفتار کا

---

[1] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۲-۲۲۳، خطوط غالب (ا: ۱۳۶) (بنام نواب انور الدولہ بہادر شفق)

[2] اردوئے معلیٰ صفحہ ۲۲۵، خطوط غالب (ا: ۱۴۵-۱۴۶)

بدل؟ اُس کے واسطے چاہیے دوسرا قصیدہ اس زمین میں ایک اور لکھنا، اور وہ تکلفِ بارد ہے۔ بلکہ شاید حضرت کو یہ منظور بھی نہ ہو۔"

یعنی محض "زبان کا درست" اور "الفاظ کا بامحل اور باموقع" ہونا کافی نہیں۔ "طرزِ گفتار" کا اہلِ زبان کے محاورے اور روزمرے کا سا ہونا شرط ہے۔ اور یہ چیز ہر ایک کے حصّے میں نہیں آتی۔ درست زبان اور بامحل الفاظ تو ہر وہ شخص لکھ لے سکتا ہے، جس نے کسی زبان کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے قواعد پر حاوی ہو گیا ہے۔ اس کی مثال میں ہندستان کے انگریزی لکھنے والے پیش کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں پچھلے ایک سو برس سے اوپر اسکولوں اور کالجوں میں انگریزی پڑھائی جاتی ہے۔ بلامبالغہ ہزاروں ہندستانی مصنفوں نے انگریزی زبان میں کتابیں لکھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہماری انگریزی سے متعلق انگریزوں کی جو رائے ہے۔ اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ چند برس اُدھر جب ہمارے ایک سیاسی لیڈر نے اپنی سوانح عمری لکھی تو ولایت کے تمام اخباروں نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے، اس بات کا خاص طور پر ذکر کیا کہ کتاب کی زبان ایسی ہے جو انگریزوں کو خاص طور پر پسند آئے گی کیوں کہ وہ ان کا روزمرہ لکھتے ہیں اور اس میں کسی طرح کی اجنبیت اور تصنع نہیں۔ اور یہ بھی اس لیے، کہ یہ صاحب بچپن سے ولایت میں تعلیم پاتے رہے تھے۔ مدعا یہ کہ اس تمام علم و فضل کے باوجود ہمارے کتنے اصحاب کو یہ سندِ قبول ملی ہے۔

پس غالب کا اعتراض یہ تھا کہ ان حضرات کی زبان میں فارسیت نہیں یا دوسرے لفظوں میں "ایرانیوں کی سی ادا" نہیں۔ زبان درست ہے کلام موزوں ہے۔ اگر آپ اس پر اصلاح دینا چاہیں تو اس میں غلطی نہیں پائیں گے سوائے اس کے کہ کسی جگہ، ترکیب یا محاورے کی غلطی ہو کہ شاعر ناواقفی کے سبب ہندی محاورے کو فارسی میں لکھ جائے۔ لیکن اس کے باوجود آپ اس میں کسی چیز کی کمی پائیں گے کیوں کہ "ورائے شاعری چیزے دگر ہست" اور یہ چیزے دگر، صرف اہلِ زبان کے حصّے میں آتی ہے۔

میرزا نے قاطع برہان کسی خاص ارادے اور اہتمام سے نہیں لکھی تھی۔ یہ کتاب محض اتفاق سے مرتب ہو گئی۔ اگر ۱۸۵۷ء کی شورش نہ ہوئی ہوتی اور ان کے معمولی مشاغل جاری رہتے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب کبھی عالمِ وجود میں نہ آتی۔ چوں کہ ان دنوں وہ کہیں باہر جا نہیں سکتے تھے اور صرف ایک برہان قاطع کا نسخہ ان کے پاس رہ گیا تھا اس لیے وہ دفع الوقتی کے لیے اس کی ورق گردانی کرنے لگے۔ یہاں انھیں کتاب کے صفحے صفحے پر بوالعجبیوں کا گلزار نظر آیا۔ اس سے ان کی رگِ ظرافت حرکت میں آئی۔ چنانچہ جہاں کہیں کوئی لطیفہ ذہن میں آجاتا وہ اس کے حاشیے پر لکھ دیتے۔ غدر کے بعد انھوں نے اپنے خاص دوستوں کے دیکھنے کو، یہ سب اشارات جمع کر کے ایک جگہ لکھوا لیے۔ اب بھی وہ انھیں شائع نہیں کرنا چاہتے تھے۔ لیکن پھر انھیں خیال آیا کہ اگر انھیں باقاعدہ مرتب کر کے کتابی شکل میں چھاپ دیا جائے تو میرا پرانا دعویٰ ثابت

ہوجائے گا کہ ہندستان کے فارسی داں غلط فہم اور غلط نویس ہیں۔ اسی کو وہ "باسی کڑھی میں اُبال آیا" سے تعبیر کرتے ہیں۔ چناں چہ انھوں نے اس پر نظرِ ثانی کی اور حک و اصلاح اور حذف و اضافے کے بعد اسے شائع کر دیا۔

پھر اس کے بعد جس طرح شرم و حیا اور تہذیب و شرافت کی مٹی پلید ہوئی، وہ ہماری ادبی تاریخ کا بہت ہی افسوس ناک باب ہے، لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اگر "البادی اظلم" کے اصول سے دیکھا جائے تو اس کے لیے، بہت حد تک خود میرزا ذمہ دار تھے۔ انھوں نے اپنی "درشت گفتاری" کی جو توجیہ کی ہے، وہ بہت بودی ہے۔ کوئی لاکھ "سپاہی زادہ" ہوا کرے، اسے ہرگز یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی دوسرے کا مذاق یا تمسخر اڑائے، یا اسے سخت سست کہے، خاص کر جب بحث کا موضوع بھی علمی اور تحقیقی ہو۔ بے شک، میرزا نے اپنی تحریر میں شوخ طبعی اور بذلہ سنجی کے جوہر دکھائے ہیں لیکن علمی مسئلوں کی تحقیق میں شوخی اور ظرافت نہیں، بلکہ متانت اور سنجیدگی درکار ہے۔ اسی لیے، مفتی میر محمد عباس نے انھیں ٹوکا تھا کہ آپ نے یہ کیا غضب کیا۔[۵] اس کا ایک ہی نتیجہ نکل سکتا تھا کہ مخالف بھی ترکی بہ ترکی جواب دیتے یا پھر ان سے نیچی سطح پر آکے گالیاں دینے لگتے۔ اور ہوا بھی یہی، چوں کہ وہ ظرافت کے اہل نہیں تھے پھکڑ بازی پر اتر آئے۔

---

۵ مکاتیب غالب صفحہ ۱۵۳ (حواشی متعلقہ صفحہ ۴۱)

بہرحال ایک بات بالکل واضح ہوگئی کہ میرزا اپنے دعوے میں بالکل سچے تھے۔ انھوں نے یہ ثابت کردیا کہ ہندستانی فارسی دان ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ اپنے قیاس کی پیروی میں نہ صرف خود قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے ہیں، بلکہ دوسروں کی بھی گم راہی کا سبب بنتے ہیں۔

خودداری بظاہر مدح نگاری اور خودداری کا کسی شخص میں جمع ہونا محال نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ بات درست نہیں۔ مدح نگاری کا تعلق شاعری سے ہے، جو اکتسابی چیز ہے۔ خودداری کردار کا جزو ہے، جو فطری چیز ہے۔ جب شاعر قصیدے میں زمین و آسمان کے قلابے ملا رہا ہوتا ہے، تو وہ خوب جانتا ہے، کہ یہ رسمی باتیں ہیں۔ اور ممدوح کو بھی معلوم ہوتا ہے، کہ یہ سب کچھ "سخن گسترانہ" کلام ہے جس سے شاعر کا مقصود اپنی قدرتِ کلام کا اظہار اور حصولِ صلہ و ستائش ہے، ورنہ اس میں حقیقت کا کوئی شائبہ نہیں۔

پس کسی شاعر کی مدح گوئی اور قصیدہ نگاری سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ ذلیل اور خوشامد پرست ہے غلط استدلال ہے۔ بعض لوگوں نے کم نظری کے باعث اسی بنا پر میرزا پر بھی اعتراض کیا ہے اور انھیں بے غیرت اور نہ معلوم کیا کیا کچھ کہا ہے۔ حالانکہ نہ اکیلے غالب نے قصیدہ نگاری کا "گناہ" کیا اور نہ ہی یہ بے غیرتی کی دلیل ہے۔ کسی شخص کے اصلی کردار کا اندازہ اس کی روزمرہ کی زندگی کے طرزِ عمل سے لگانا چاہیے۔ ہم میرزا کی زندگی کے دو واقعے لیتے ہیں۔

۱۸۲۷ء میں وہ کلکتہ جاتے ہوئے کچھ مدت کے لئے لکھنؤ ٹھیرے۔ نصیر الدین حیدر شاہ کا زمانہ تھا اور معتمد الدولہ آغا میر سلطنتِ اودھ کے وزیرِ اعظم تھے۔ آغا میر کے ایما پر بعض دوستوں کی رائے ہوئی کہ نائب سلطنت سے غالب کی ملاقات کرائی جائے، لیکن میرزا نے دو شرطیں پیش کر دیں اوّل یہ کہ میں نقد نذر پیش کرنے سے معاف رکھا جاؤں دوسرے یہ کہ میرے پہنچنے پر معتمد الدولہ کھڑے ہو کر میری پذیرائی کریں۔ چوں کہ آغا میر کو یہ دونوں شرطیں منظور نہ تھیں اور غالب ان سے کم کو اپنی غیرت اور خودداری کے منافی خیال کرتے تھے اس لئے ملاقات نہ ہو سکی۔

یاد رہے کہ اس وقت ان کی عمر تیس برس سے زیادہ نہیں تھی ابھی سرکارِ انگریزی سے انھیں خلعت اور دربار کے منصب نہیں ملے تھے بادشاہِ دہلی کے دربار سے بھی ان کا کچھ یونہی سا تعلق تھا۔ مدعا یہ کہ اس ابتدائی زمانے میں، جب ابھی وہ اعزاز و اکرام کے عادی نہیں ہوئے تھے اور جوانی کی عمر میں، جب ان چیزوں کی ہوس زیادہ ہوا کرتی ہے، ان کا سلطنتِ اودھ کے وزیرِ اعظم سے ان اسباب کی بنا پر ملاقات نہ کرنا اس بات کی قطعی دلیل ہے کہ انھیں شروع سے اپنی عزتِ نفس کا کس قدر خیال تھا۔

دوسرا واقعہ اس سے پندرہ برس بعد کا ہے۔ ۱۸۴۲ء میں انھوں نے دہلی کالج کی فارسی مدرسی کا عہدہ محض اس وجہ سے ٹھکرا دیا کہ جب وہ اس سلسلے میں ٹامسن صاحب سے ملنے کو ان کے مکان پر گئے تو آگے سے کوئی شخص

ان کے استقبال کو نہیں آیا۔ اس زمانے میں وہ انگریزوں کے وظیفہ خوار تھے۔ درباروں میں شامل ہوتے اور قصیدے پڑھتے تھے، اور انعام میں خلعت پاتے تھے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود انھوں نے صوبے کے سب سے بڑے انگریز حاکم سے ملاقات اور کالج میں ملازمت سے انکار کر دیا۔ حالانکہ "وہ" ان کے خداوندانِ مجازی کی خوشنودی کا باعث اور "یہ" ان کے اظہارِ کمال کا ذریعہ بن سکتی تھی اور یہ دونوں باتیں ایسی ہیں جو بظاہر ان کا عین مقصود ہونا چاہیے تھیں۔ لیکن وہ اس کی پرواہ نہیں کرتے اور بات صرف اتنی سی ہے کہ جب میں کوٹھی پر ملاقات کو گیا ہوں تو کوئی شخص پذیرائی کو کیوں نہیں آیا؟

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

یہ استغنا اور آزادہ روی، ان کی خوددار فطرت کا عکس ہے، جس میں تصنع کا کوئی دخل نہیں۔ انسان تصنع اس وقت کرتا ہے جب اسے کوئی توقع یا غرض ہو، صلے کی یا ستایش کی۔ ان دونوں موقعوں پر صلہ و ستایش تو در کنار، بجا طور پر نقصان یقینی تھا۔

غدر میں ان کا حال بہت پتلا ہو گیا تھا۔ آمدنی کے تمام راستے بند اور خرچ بدستور۔ اس کے باوجود انھوں نے نہایت حوصلہ مندی سے کام لیا۔ ان کے اس زمانے کے بعض خطوط سے حسنِ طلب کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن یہ سب اضطراری حرکات ہیں۔ نہ وہ اس کے عادی تھے نہ اس میں

لذت محسوس کرتے تھے اور ان گنتی کے چند مقامات پر بھی انھوں نے حد سے تجاوز نہیں کیا بلکہ یونہی سا اشارہ کیا ہے۔ ایسے اعمال قابلِ گرفت نہیں ہوا کرتے اور نہ ہی ان سے عام نتیجہ نکالا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ جونہی رام پور سے مستقل وظیفہ مقرر ہو گیا اور اس کے تھوڑی مدت بعد پنشن بھی جاری ہو گئی تو وہ پھر اپنی اصلی روش پر آ گئے۔

احسان مندی

ایک اعلیٰ کردار کی یہ بھی خصوصیت ہوا کرتی ہے، کہ وہ دوسروں کا احسان کبھی نہیں بھولتا خواہ بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو۔ غدر کے ایام میں میرزا کے بعض ہندو دوستوں نے ان سے ہمدردی کا اظہار کیا اور حتی الوسع ان کی خدمت کرتے رہے۔ میرزا نے دستنبو میں ان اصحاب کا خاص طور پر ذکر کیا اور لکھا کہ اگرچہ یہ بات معمولی نظر آتی ہے اور میں اسے آسانی سے نظر انداز کر دے سکتا تھا لیکن احسان مندی کا تقاضا یہ ہے کہ میں ان صاحبوں کا شکریہ ادا کروں۔

جوئے کے مقدمے میں جب ان پر ابتلا آیا تو ان دنوں شیفتہ ان سے بہت دلسوزی اور غم خواری سے پیش آئے تھے۔ میرزا نے اپنے مشہور ترکیب بند "اسیریہ" میں ان کی اس خدمت کا پُر جوش اعتراف کیا ہے۔ غدر کے بعد شیفتہ بھی ماخوذ ہو کر سات برس کے لئے جیل خانے بھیج دیئے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے اپیل میں بری ہو گئے۔ چوں کہ ان کی جاگیر بھی ضبط ہو گئی تھی اس لئے وہ رہائی کے بعد چند دن میرٹھ میں ایک دوست کے

ہاں مقیم رہے تھے۔ جونہی میرزا نے ان کی رہائی کا سنا، فوراً ان کی ملاقات کو میرٹھ گئے، اور چار دن وہاں ٹھیرے۔ ان دنوں دہلی میں آمد و رفت پر جان گزا پابندیاں عائد تھیں۔ اس کے علاوہ کسی "مشکوک" شخص سے راہ و رسم رکھنا کس قدر خطرناک ہو سکتا تھا، اس سے متعلق کچھ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن میرزا نے ان باتوں کی پروا نہ کی اور میرٹھ چلے گئے۔ یہ اسی احسان کا احساس تھا جو گیارہ بارہ برس پہلے شیفتہ نے ان سے کیا تھا۔

اسی جذبے کا ایک اور پہلو ملاحظہ ہو۔ جن دنوں سلطان عالم واجد علی شاہ، تختِ اودھ پر جلوہ فرما تھے میرزا نے دو بار ان سے خلعت حاصل کیا اور دونوں مرتبہ حضرت مجتہد العصر لکھنؤ کے توسط سے۔ اس کے بعد جب شاہِ اودھ معزول ہو کر کلکتہ تشریف لے گئے تو میرزا نے پھر ایک قصیدہ لکھا۔ اگرچہ اب قبلہ مجتہد العصر کے توسط کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ ممدوح کلکتہ میں تھا اور متوسط لکھنؤ میں۔ لیکن اس کے باوجود میرزا کے جذبۂ شکرگزاری نے یہ گوارا نہ کیا کہ قصیدہ براہِ راست یا کسی اور واسطے سے نذر گذرانیں۔ اس لیے انھوں نے قصیدہ حسبِ سابق حضرت مجتہد العصر کی خدمت میں لکھنؤ روانہ کر دیا کہ وہ اسے کلکتہ بھجوا دیں۔

انھوں نے ان سب موقعوں پر جو طرزِ عمل اختیار کیا، وہ اس کے لیے مجبور نہیں تھے۔ اگر وہ خاموش رہتے تو کوئی شخص ان پر اعتراض نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن جب کسی بیرونی اثر یا دباؤ کے بغیر انھوں نے ایسا کیا تو ماننا پڑے گا کہ یہ واقعی ان کے قلب اور ضمیر کی آواز تھی جس نے

انھیں یہ رویّہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا تھا۔

مذہب میرزا کے مذہب کا مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے، جن پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ حالانکہ میری نظر میں ان کے عقائد سے متعلق کسی قسم کا شبہہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دراصل اس بارے میں اختلاف اس لئے پیدا ہوا کہ حکیم محمود خاں اور نواب ضیاء الدین احمد خاں نے میرزا کی تجہیز و تکفین، اہلِ تشیع کے طریقے پر نہیں ہونے دی۔ اس سے بعض لوگوں نے فرض کر لیا کہ ان دونوں صاحبوں اور خاص کر نواب ضیاء الدین احمد خاں کے زیادہ کون ان کے معتقدات سے واقف ہو سکتا تھا اور جب انھوں نے تمام رسوم اہلِ تسنن کے عقیدے کے مطابق ادا کیں تو یقیناً انھیں معلوم ہو گا کہ میرزا دراصل اسی مسلک کے پیرو تھے اور شیعی نہیں تھے۔ حالانکہ یہ سراسر مغالطہ ہے۔

جہاں تک اقرار باللسان کا تعلق ہے، میرزا ساری عمر کھلے بندوں اپنے شیعی ہونے کا اعلان کرتے رہے اور اس میں ان کے مخاطب سُنّی اور شیعہ دونوں فرقوں سے تعلق رکھنے والے بزرگ تھے۔ فرماتے ہیں:۔

"میں موحد خالص اور مومن کامل ہوں، زبان سے لاالٰہ الا اللہ کہتا ہوں اور دل میں لاموجود الا اللہ، لامؤثر فی الوجود الا اللہ، سمجھے ہوئے ہوں۔ انبیا رسب واجب التعظیم اور اپنے اپنے وقت میں مفترض الطاعت تھے۔ محمد علیہ السلام پر نبوت ختم ہوئی۔ یہ خاتم المرسلین

اور رحمۃ" للعالمین ہیں۔ مقطع نبوت کا مطلع امامت۔ اور امامت نہ اجماعی بلکہ من اللہ ہے اور امام من اللہ علی علیہ السلام ہے ثم حسن ثم حسین، اسی طرح تا مہدی موعود علیہ السلام ع

بریں زیستم ہم بریں بگذرم"

(بنام نواب علاء الدین احمد خاں سیفی)

"غالب، اثنا عشری حیدری" (بنام غلام حسنین قدر بلگرامی۔ شیعی)

"بندہ علی ابن ابی طالب، اسد اللہ المتخلص بغالب" (بنام محمد حسن ناخدائے شیرازی۔ شیعی)

"عطیۂ حضرت بتوسط جناب سیف الحق پہنچا اور میں نے اس کو بے تکلف عطیۂ مرتضوی سمجھا۔ علی مرتضیٰ علیہ التحیہ والثنا آپ کا دادا اور میرا آقا۔ خدا کا احسان ہے کہ میں احسان مند بھی ہوا تو اپنے خداوند کے پوتے کا" (بنام نواب میر غلام بابا خان بہادر سنی)

"میں علی کا غلام اور اولادِ علی کا خانہ زاد" (بنام حکیم سید احمد حسین مودودی سنی)

"صاحب! بندہ اثنا عشری ہوں۔ ہر مطلب کے خاتمہ پر ۱۲ کا ہندسہ کرتا ہوں۔ خدا کرے کہ میرا بھی خاتمہ اسی عقیدے پر ہو۔ ہم تم ایک آقا کے غلام ہیں" (بنام مرزا حاتم علی مہر۔ شیعی)

"جانتے ہو کہ علی کا بندہ ہوں۔ اس کی قسم کبھی جھوٹ نہیں کھاتا"

(بنام یوسف میرزا۔ شیعی)
"خدا کے بعد نبی اور نبی کے بعد امام۔ یہی ہے مذہب حق، والسّلام
والاکرام، علی علی کیا کرو اور فارغ البال رہا کرو۔" مجروح۔ سنّی)
امامت من اللہ کا ثبوت انھوں نے ایک قصیدے میں یوں دینے کی کوشش کی ہے ؎

حقا کہ لفظِ احمد و لطفے کہ تحتِ اوست — گنجینیست شایگاں و طلسمیست استوار
اما پے گشایشِ ایں معنوی طلسم — فطرت شگرف قاعدۂ کرد اختیار
باید نخست میم زاحمد فرا گرفت — کاں میم اسم فطرتِ نبی راست پردہ دار
ہر گہ بہ یُمنِ معرفتِ ذاتِ احمدی — میم از میانہ رفت و احد گشت آشکار
بے پردہ بنگر از الف، اللہ جلوہ گر — وز حا و دال بشمر و دریاب ہشت و چار

اور وہ اس عقیدے پر بہت ابتدا سے قائم تھے۔ مثنوی ابرِ گہر بار غالب ۱۸۴۵ء میں مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے منقبت کے باب میں لکھتے ہیں ؎

کہ تا کینہ از مہر بشناختم — بکس غیر حیدر نہ پرداختم
جوانی بریں در بسر کردہ ام — شبے در خیالش سحر کردہ ام

یعنی میں نے جب سے ہوش سنبھالا اور کینہ اور محبت کے درمیان فرق کرنا سمجھا، اسی دن سے حضرت علی کے سوائے کسی دوسرے سے سروکار نہیں رکھا اسی کے در پر اپنی جوانی کے ایام بسر کر دیئے اور اسی کی یاد میں راتیں گزار دیں۔ اور انھوں نے اس میں کوئی مبالغہ نہیں کیا۔ ان کے ابتدائی زمانے کے کلام میں جو نسخۂ حمیدیہ میں چھپا ہے اس طرح

کے کئی شعر موجود ہیں ؎

ہزار آفت و یک جانِ بے نوائے اسدؔ
خدا کے واسطے، اے شاہِ بیکساں، فریاد

جس جگہ ہے مسند آرا، جانشینِ مصطفےٰ
اس جگہ تختِ سلیماں، نقشِ پائے مور ہے

اسدؔ، جہاں کہ علیؑ بر سرِ نوازش ہو
کشادِ عقدۂ دشوار، کارِ آساں ہے

کثرتِ اندوہ سے حیران و مضطر ہے اسدؔ
یا علیؑ! اوقتِ عنایات و دمِ تائید ہے

حرمتِ جانِ محمدؐ، یک نظر کن سوئے من
یا علیؑ، یا مرتضیٰؑ، یا ابو الحسنؑ، یا ابو تراب

یہ بیانات پڑھنے کے بعد ناممکن ہے، کہ کوئی شخص انھیں شیعیانِ علیؑ کے سوائے، کسی دوسرے گروہ میں شمار کر سکے۔ لیکن یہ بھی واقع ہے، کہ ان کی شیعیت صرف اسی حد تک ہے، کہ وہ حضرت علیؑ کرم اللہ وجہہ کو تمام دوسرے صحابہ پر ترجیح دیتے ہیں۔ مثلاً ایک جگہ انھوں نے باقی صحابۂ رسول کو ستاروں اور حضرت علی کو چاند سے تشبیہہ دی ہے۔ لکھتے ہیں ؎

شرطست کہ بہرِ ضبطِ آداب و رسوم
خیز و بعد از نبی، امامِ معصوم
زاجماع چہ گوئی، بہ علی باز گرائے
مہ جائے نشینِ مہر باشد، نہ نجوم

اس کی تعبیر ہم دوسرے لفظوں میں یوں بھی کر سکتے ہیں، کہ ان کی شیعیت کا

امتیازی نشان تبرا نہیں، بلکہ تولّا ہے، یعنی وہ دوسرے صحابہ پر تبرا نہیں کرتے، بلکہ حضرت علیؑ سے اپنے تولّا و محبت کا شدت سے اظہار کرتے ہیں۔ اب یہ کوئی مخصوص شیعی عقیدہ نہیں، بلکہ تفضیلی سُنّی بھی یہی مسلک رکھتے ہیں۔

اس فیصلے میں ایک اور بات بھی ہماری تائید کرتی ہے شیعیت کو شروع سے تصوف سے ایک طرح کا بیر رہا۔ بقول سیّد علی بلگرامی شیعہ حضرات کو حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے اس لئے کد ہے کہ اس سے ان کی آدھی سلطنت چھن گئی۔ اگر ان حضرات صوفیہ کی تعلیم نہ ہوتی تو آج سب مسلمان شیعہ مسلک کے پیرو ہوتے۔ خیر یہ تو لطیفہ ہے، لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ شیعہ، صوفی نہیں ہو سکتا۔ سیّد عبّاس شوستری تو تصوف سے اپنی برأت کا اظہار کرنے میں اس حد تک چلے گئے ہیں ؎

ایں کلامِ صوفیانِ شوم نیست مثنوی مولوی روم نیست

اہلِ نظر سے مخفی نہیں کہ جب ایران میں سولہویں صدی عیسوی میں صفوی خاندان برسرِ اقتدار آیا اور شیعیت ملک اور حکومت کا مذہب قرار پائی، تو ایران سے تصوف کی شاعری بھی ختم ہو گئی۔ چنان چہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے بعد الا ماشاء اللہ وہاں سے کوئی قابلِ ذکر صوفی شاعر نہیں پیدا ہوا اس کے مقابلے میں میرزا اپنے تصوف کا بھی اسی شد و مد سے اعلان کرتے ہیں جیسے شیعیت کا ؎

ہمچو من شاعر و صوفی و نجومی و حکیم نیست در دہر، قلم مدعی و نکتہ گر است

یہ مسائلِ تصوف، یہ ترا بیان غالؔب   تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ خوار ہوتا

"میں صوفی ہوں۔ ہمہ اوست کا دم بھرتا ہوں۔" (بنام سرفراز حسین)

"صبر و تسلیم و توکل و رضا، شیوہ صوفیہ کا ہے۔ مجھ سے زیادہ اس کو کون سمجھے گا۔" (بنام مجروؔح)

اور یہ صرف قول ہی کی حد تک نہیں تھا بلکہ وہ حضرت مولانا فخر الدینؒ کے پوتے مولانا نصیر الدینؒ عرف میاں کالے صاحب سے بیعت بھی تھے[1]۔ کون غالی شیعہ، کسی غیر شیعہ، سنی صوفی کے ہاتھ پر بیعت کرے گا؟

پس مختصراً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ خدا کی وحدانیت پر یقینِ کامل رکھتے ہیں، اور نجات کے لئے نبوت پر ایمان کو واجب سمجھتے ہیں۔ نبوت کے بعد امامتِ مرتضوی کے قائل ہیں اور اسی طرح بارہ اماموں پر اعتقاد رکھتے ہیں اور امامت کے من اللہ ہونے کے معتقد ہیں۔ وہ تمام صحابہ کا ادب کرتے ہیں لیکن حضرت علیؑ کو سب دوسرے صحابہ پر ترجیح اور فضیلت دیتے ہیں۔ ان کے اپنے خیال میں یہ اثنا عشری شیعہ عقیدہ ہے۔ آپ چاہیں تو انھیں تفضیلی

---

[1] میر مہدی مجروؔح کو لکھتے ہیں:۔

"سنو میر نصیر الدین اولاد میں سے ہیں شاہ محمد اعظم صاحب کے۔ وہ خلیفہ تھے، مولوی فخر الدین صاحب کے، اور میں مرید ہوں اس خاندان کا۔" (اردوئے معلی صفہ ۱۲۹ خطوط غالب ۱۹۴۱ء)

مولانا فخر الدینؒ اور ان کے صاحبزادے مولانا غلام قطب الدینؒ دونوں کا آگے پیچھے ۱۷۸۵ء میں یعنی غالؔب کی ولادت سے بارہ تیرہ برس پہلے انتقال ہوا۔ ظاہر ہے کہ وہ مولانا غلام قطب الدینؒ کے صاحبزادے میاں کالے صاحب ہی کے مرید ہو سکتے ہیں۔

سنی بھی کہہ سکتے ہیں۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ کونسا خارجی اثر تھا جس کے تحت انھوں نے شیعیت اختیار کی کیوں کہ قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی اپنی ننھیال جہاں ان کی پرورش ہوئی غالباً سنّی طریقے کی پابند تھی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اس میں مُلّا عبدالصمد کی صحبت کو بہت دخل رہا ہوگا۔ ایران کی بھاری اکثریت شیعہ مسلک کی پیرو ہے اور یہ بہت حد تک یقین سے کہا جا سکتا ہے، کہ مُلّا عبدالصمد بھی اپنے ماحول کے اقتضا سے اسی عقیدے کے

ے یہاں غالباً ایک دلچسپ خبر کا تذکرہ نامناسب نہیں ہوگا میرزا کی وفات کے بعد آگرے کے ماہانہ رسالے "ذخیرہ بال گوبند" کے مارچ ۱۸۶۹ء کے پرچے میں ان سے متعلق ایک مضمون شائع ہوا تھا۔ اس میں یہ عبارت بھی تھی :۔

"ایک عرصہ ہوا جب یہ نامی شاعر زیورِ اسلام اُتار کر حلیۂ فریمیسن سے آراستہ ہوا تھا۔ ہر چند اس کے احباب نے حال اس مذہبِ نو اختیار کا اور کیفیت فریمیسن ہوس کی دھو کا دے دے کر بھی دریافت کی، پر اس نے ایک کلمہ بھی اپنی زبان سے نہ نکالا یہی کہے گیا کہ کچھ نہ پوچھو" (احوالِ غالب صہ ۲۱) آیا میرزا فریمیسنی حلقے میں شامل ہوئے، یا نہیں اس سے متعلق تو یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن "زیورِ اسلام" اُتارنے کی بات تو ظاہر ہے کہ غلط ہے۔ قطع نظر اس سے کہ غالب کی کئی اپنی تحریریں اس کی تردید میں پیش کی جا سکتی ہیں، فریمیسنوں میں شامل ہونے کے لئے آبائی مذہب ترک کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔

ماننے والے ہوں گے۔ میرزا نے تیرہ چودہ برس کی عمر میں ان سے تعلیم حاصل کی۔ اور یہ وہ زمانہ ہے جب انسان کی طبیعت بہت جلد بیرونی اثر قبول کر لیتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہے کہ ان کے تعلقات نواب حسام الدین حیدر خاں کے خاندان سے نہایت ابتدائی زمانے سے تھے اور ان کے صاحبزادے ناظر حسین میرزا ان کے بچپن کے ہمجولی تھے اور یہ خاندان بھی کٹر شیعہ تھا۔ اس لئے عین ممکن ہے کہ ان اثرات نے مجموعی طور پر مل کر میرزا کو بھی شیعیت کی طرف مائل کر دیا ہو۔

اگرچہ کسی شاعر کی غزلوں سے اس کے مذہبی معتقدات پر بحث کرنا درست طریقہ نہیں، لیکن بعض اوقات شاعر اس پردے میں اپنے تجربات بیان کر جاتا ہے۔ غالب کی ایک غزل میں بھی ایک شعر ایسا ہے، جو ان کی آپ بیتی معلوم ہوتا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

بامن میاویز اے پدر فرزندِ آزر را نگر
ہر کس کہ شد صاحب نظر، دینِ بزرگاں خوش نکرد

اگر میرا قیاس درست ہے تو ہم اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ ان کی تبدیلیِ مسلک پر گھر میں ان کی مخالفت ہوئی تھی۔ پدر میں ممکن ہے کہ اشارہ ان کے نانا، مرزا غلام حسین خاں کمیدان کی طرف ہو۔

آپ نے اوپر میرزا غالب کی زندگی کا ایک ہلکا سا خاکہ دیکھا ہے۔ آج جب کہ ان کی وفات پر اتنا لمبا عرصہ گذر چکا ہے، ہمارے لئے ممکن نہیں کہ

اس خاکے میں مزید رنگ و روغن بھر سکیں۔ بے شک یہ حالات بہت مختصر ہیں، لیکن اس سے زیادہ مل بھی نہیں سکتے۔ جن لوگوں نے انھیں اپنی آنکھوں دیکھا تھا وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔ آج سے پچاس ساٹھ برس اُدھر ہمارے تذکرہ نویسوں کی جو روش تھی اس کے پیشِ نظر ان سے یہ توقع رکھنا کہ وہ کسی شاعر کے حالات میں تفصیل سے کام لیتے امیدِ موہوم سے کم نہیں۔ وہ تو خوش قسمتی سمجھیے کہ میرزا کے اپنے فارسی اور اردو خط چھپے ہوئے موجود ہیں، جو ایک طرح سے مصنف کی خود نوشت سوانح عمری ہے۔ ورنہ اتنا بھی ممکن نہ تھا۔

آپ نے ان صفحوں میں ایک بولتی چالتی شخصیت کی تصویر ملاحظہ فرمائی۔ وہ ہمارے ہی جیسے گوشت پوست کے انسان تھے۔ ان میں جہاں انسانی کردار کی بلندیاں ملتی ہیں، وہیں بشری کمزوریوں کی پستیاں بھی موجود ہیں۔ وہ اپنی قوم کی بیشتر خصوصیات کے حامل ہیں۔ میرزا ترک ایبک تھے۔ ترک قوم دوستوں سے وفا پرستی، عیش و عشرت سے دلچسپی، مذہب سے ادب اور عقیدت لیکن در اصل آزادہ روی، دشمنی اور مخالفت میں ضد اور انجام سے بے پروائی کے لیے مشہور ہے۔ آپ نے دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک صفت میرزا کی فطرت کا جزو ہے۔ وہ دوست نواز ایسے ہیں کہ اپنے منہ کا نوالہ دوست کے حوالے کر دیں اور خود فاقے سے رہنے میں دریغ نہ کریں۔ ہم نے کتنی مثالیں ہدیہ ناظرین کی ہیں اور ان میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ عیش پرستی پر مزید لکھنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ یہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ ترکوں کے مذہب

سے متعلق کتنی ہی غلط فہمیاں ہیں جو عوام میں پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر اس سلسلے میں ایک بات یاد رہے، کہ وہ اسلام پر ایمان لے آئے، تو اس لیے نہیں کہ انھوں نے اسے اپنے مذہب سے بہتر پایا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ ان کا اپنا مذہب کوئی تھا ہی نہیں، اور ان کی فطرت اس وقت ایک مذہب کی طلب گار تھی۔ یہ محض اتفاق تھا کہ اسلام ان کے سامنے آگیا۔ اگرچہ یہ حقیقت ہے کہ انھوں نے اس کے بعد اسلام کی خدمت بھی کی اور اسلام کو ان کے ذریعے مادی تقویت اور دینوی رعب بھی حاصل ہوا لیکن اس سے بھی انکار ممکن نہیں کہ ان کا اسلام ہمیشہ بہت حد تک سطحی رہا اور ان کے اعتقاد میں کبھی گہرائی اور عصبیت پیدا نہیں ہوئی اور وہ عام طور پر آزاد منش رہے۔ کیا میرزا غالب کا اسلام اس سے کچھ مختلف ہے؟

وفا پرستی، ترکی تاریخ کا درخشاں باب ہے۔ دور کیوں جائیں، صرف آخری دونوں عالمگیر جنگوں ہی کو لے لیجیے۔ انھوں نے جسے حلیف بنایا، اس سے آخر تک نبھائی۔ اس میں ان پر مشکلیں بھی پڑیں۔ بعض اوقات چاروں طرف سے خطرے کے بادل امنڈ امنڈ کر آئے اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ ابھی پھٹ پڑیں گے اور ترکوں کو ایک ہی ریلے میں خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جائیں گے لیکن اس کے باوجود ان کے قدم نہ ڈگمگائے اور وہ اپنی جگہ پر چٹان کی طرح قائم رہے۔

میرزا کی سوانح عمری دیکھیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ انھوں نے امین الدین احمد خاں اور ضیاء الدین احمد خاں دونوں بھائیوں کے پہلو بہ پہلو

ان کے حریف نواب شمس الدین احمد خاں کا مقابلہ کیا اور انجام سے بے پروا ہو کر۔ پھر غلط یا صحیح، انھوں نے ہندستان کے فارسی نویسوں کے خلاف آواز اُٹھائی اور یوں گویا ہندستان بھر کے مردہ پرستوں اور لکیر پیٹنے والوں کی دشمنی مول لے لی۔ اس میں انھیں کیا کچھ سننا اور جھیلنا نہ پڑا۔ لیکن کیا انھوں نے ڈر کے اس سے ہاتھ کھینچ لیا؟ کیا اس مخالفت سے ان کے "کلام کی گرمی" مدھم پڑ گئی یا ان کے "قلم کی آتش افشانی" میں کمی آگئی؟ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان کے اعتراضوں کی شدت بڑھتی گئی اور وہ مرتے دم تک اسی عقیدے پر قائم رہے۔

البتہ ان میں ایک صفت ایسی تھی جو ترکوں میں نہیں پائی جاتی۔ ترکوں میں ایجاد اور اختراع کا مادہ سرے سے نہیں۔ آپ کوئی ایسی مثال پیش نہیں کر سکتے جہاں کسی ترک نے کسی میدان میں کوئی نئی دریافت کی ہو۔ میرزا اس کلیے سے مستثنیٰ تھے۔ ان کے آبا و اجداد سو پشت سے سپہ گری کرتے آئے تھے انھوں نے اس کے خلاف شاعری اور علم و ادب کا پیشہ اختیار کیا۔ نظم و نثر کا جو سرمایہ ان سے پہلے موجود تھا وہ آج بھی ہمارے سامنے ہے۔ اگر وہ اسی راہ پر چلے جاتے جو ان کے پیش رو پامال کر چکے تھے تو اس میں وہ کونسا امتیاز حاصل کر لے سکتے تھے۔ لیکن انھوں نے اسے بالکل چھوڑ دیا اور اپنے لئے ایک نئی راہ بنانے کی کوشش کی۔ اِس میں انھیں قدرتاً وہی دقتیں پیش آئیں جو ہر فن کے پہلے رہنما اور محقق کو پیش آیا کرتی ہیں۔

لوگ میرزا کی زبان اور اسلوب بیان پر اعتراض کرتے ہیں۔ اگرچہ

بسا اوقات ان میں سے بشیتر خود معترض کی کم علمی پر مبنی ہوتے ہیں۔ تاہم اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے بعض واقعی درست ہیں۔ لیکن اس میں میرزا کا کیا قصور! انھوں نے اردو کی محدود وسعت میں وہ خیالات ادا کرنے کی کوشش کی جو ان سے پہلے ہمارے ہاں موجود نہیں تھے۔ نتیجہ غیر متوقع نہیں تھا۔ اگر آپ کسی بڑے تن و توش کے آدمی کو تنگ کپڑے پہنانے لگیں تو لازماً کہیں سے کپڑا مسک جائے گا اور کہیں سے اس کے ٹانکے کھل جائیں گے۔ غالب جو خیالات پیش کر رہے تھے ان کے لئے ہماری زبان میں الفاظ یا ترکیبیں موجود ہی نہیں تھیں۔ پس انھوں نے کچھ فارسی سے مستعار لیا۔ کچھ خود گڑھا اور اہلِ نظر کے سامنے حاضر کر دیا۔ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو کبھی اتنی جرأت بھی نہ کر پاتا۔ لیکن تہور اور شجاعت بھی ترکوں کا مایۂ نازش ان ہے، میرزا کیوں ڈرتے۔ ان میں ایک مصلح کی روح تھی۔ انھیں اپنے راہِ راست پر ہونے کا یقین تھا۔ لوگوں نے کیا کچھ نہ کہا جب مشاعرے کی بھری محفل میں ان کا مذاق اڑایا گیا اور ان کے کلام کی مہمل نقلیں اتاری گئیں، تو خلوت کی مجلسوں میں کیا کیا نہ ہوتا ہوگا۔ لیکن میرزا نے اس مخالفت اور تمسخر کی ذرہ برابر پروا نہ کی اور جو راہ اپنے لئے پہلے دن تجویز کر لی تھی اس سے اِدھر اُدھر نہ ہٹے۔ زمانہ سب سے بڑا قاضی ہے۔ اس کا فیصلہ ہمارے سامنے ہے۔ آج ہمیں یہ معلوم کرنے میں کہ کون غلطی پر تھا اور کون حق پر، کسی مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ ان کے ابتدائی کلام میں آورد اور تصنع کی بھرمار ہے۔

یہ بھی سچ ہے کہ کہیں کہیں ان سے محاورے میں بھی لغزش ہوگئی ہے لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا گیا، ان کی زبان میں حلاوت پیدا ہوتی گئی اور ان کے بیان میں آمد اور بے ساختگی کا پہلو غالب ہوتا گیا۔ حیرت تو اس بات پر ہے کہ وہ اتنی کامیابی بھی حاصل کر سکے۔ ان کے سامنے کوئی مثال نہیں تھی جس کی وہ نقل کر سکتے تھے۔ انھوں نے جو کچھ کیا اپنے بل بوتے پر کیا۔ ہم ان کے کلام کے عیوب سے انکار نہیں کرتے لیکن ہمیں اصرار ہے کہ ان کے مقابلے میں اس کی خوبیوں اور دور رس نتائج کا پلہ کہیں بھاری ہے۔

ہماری شاعری میں انیسویں صدی کے آخر میں جو اصلاحی تحریک شروع ہوئی اس کے سب سے پہلے علم بردار آزاد اور حالی تھے اور یہ دونوں براہِ راست میرزا سے متاثر ہوئے۔ حالی تو میرزا کے شاگرد بھی تھے۔ اقبال نے مشرق اور مغرب کے علمی اور ادبی خزانوں سے استفادہ کیا اور اس پر اپنی ژرف نگاہی اور غور و فکر سے بہت کچھ اضافہ کر کے ہماری زبان کے دامن کو مالا مال کر دیا۔ لیکن کیا اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ اقبال، غالب کے معنوی فرزند ہیں۔ اگر غالب نے اردو شاعری کو نئی شاہراہ پر نہ ڈال دیا ہوتا اور آزاد اور حالی نے اس پر سنگِ میل نہ قائم کیے ہوتے، تو اقبال، اقبال نہ ہوتے اور اگر ہوتے بھی تو کم از کم اتنی دور دراز کی مسافت طے کر کے وہ ہمارے ادب کو منزلِ مقصود کے اتنا قریب نہ پہنچا سکے ہوتے کہ آج ہمیں سوادِ منزل سامنے نظر آ رہا ہے۔

کسی زندگی کی عظمت نہ صرف اسی بات پر منحصر نہیں کہ اس میں شاندار فتوحات

اور کارنامے ہوں یا اس میں غیر معمولی ایثار اور قربانیوں کے واقعات ہوں۔ بے شک یہ بھی ایک معیار ہے لیکن اس کا ایک اور رُخ بھی ہے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ آپ نے دنیا کے اطمینان اور راحت و مسرت میں کتنا اضافہ کیا۔ آپ کے چہرے پر کھیلنے والی مسکراہٹ جو آپ کے آس پاس رہنے والوں کو خوش و خرم بناتی رہی۔ آپ کی وہ لطف آمیز گفتگو جو آپ نے کسی سوالی اور بھک منگے سے کی، حالانکہ آپ نے اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں رکھی تھی۔ آپ کی وہ معمولی معمولی مہربانیاں جن سے آپ نے بنی نوع انسان کو خوش وقت کیا۔ غرضکہ آپ کے وہ چھوٹے چھوٹے کام جن سے آپ کے ملنے والے ہمیشہ دوچار ہوتے رہے، آپ کی زندگی کو شاندار اور عظیم الشان بنانے کے لئے کافی ہیں۔ آپ اس معیار سے دیکھیں تو آپ کو میرزا کی زندگی بہت کامیاب اور بہت شاندار معلوم ہو گی۔ اور ان کا یہ فیضان آج بھی جاری ہے اور جب تک اردو اور فارسی زبانیں بولی اور سمجھی جائیں گی یہ جاری رہے گا۔ ایسے لوگ ہر روز نہیں پیدا ہوتے۔ خود میرزا نے ایک شعر میں یہی مضمون بیان کیا ہے ؎

عمرہا چرخ بگردد کہ جگر سوختۂ
چوں من از دودۂ آزر نفساں برخیزد

کتابیات

غالب کی تصنیفات

کلیات غالب (نظم فارسی)

سبد چین (مرتبہ مالک رام) طبع دوم۔ جید برقی پریس دہلی (۱۹۲۸ء)

کلیات نثر غالب (فارسی) طبع چہارم۔ نولکشور پریس کانپور (۱۸۷۵ء)

متفرقاتِ غالب (مرتبہ مسعود حسن رضوی) طبع اوّل ہندستان پریس رام پور (۱۹۴۷ء)

مآثر غالب (مرتبہ قاضی عبدالودود) طبع اوّل (بشمول علی گڑھ میگزین) مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ (۱۹۴۹ء)

درفشِ کاویانی طبع اوّل۔ اکمل المطابع دہلی (۱۸۶۵ء)

تیغِ تیز طبع اوّل۔ اکمل المطابع دہلی (۱۸۶۷ء)

لطائفِ غیبی طبع اوّل۔ اکمل المطابع دہلی (۱۸۶۴ء)

اردوئے معلّیٰ بار اوّل۔ مطبع کریمی لاہور (۱۹۲۲ء)

عودِ ہندی بار سوم۔ نولکشور پریس لکھنؤ (۱۹۲۵ء)

مکاتیبِ غالب (مرتبہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی) بار پنجم (۱۹۴۷ء)

نادراتِ غالب (مرتبہ آفاق حسین آفاق) بار اوّل۔ مشہور پریس کراچی (۱۹۴۹ء)

ادبی خطوطِ غالب (مرتبہ مرزا محمد عسکری) طبع دوم۔ انوار المطابع لکھنؤ (۱۹۳۳ء)

خطوطِ غالب (مرتبہ مہیش پرشاد) طبع اوّل سیٹی پریس الٰہ آباد (۱۹۴۱ء)

انتخاب غالب (مرتبہ محمد عبدالرزاق) دین محمدی پریس لاہور (۱۹۴۳ء)

دوسرے مصنفوں کی کتابیں

نامۂ خسرواں (مرزا جلال الدین) مطبع روزنامہ شفق۔ حیدرآباد (۱۲۹۷ھ)

یادگارِ غالب (حالی) مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۱۹۳۰ء)

غالب (مہر) عالمگیر الیکٹرک پریس۔ لاہور (۱۹۴۶ء)

آثارِ غالب (محمد اکرام) مرکنٹائیل پریس۔ لاہور

احوالِ غالب (مرتبہ مختار الدین احمد) دہلی پرنٹنگ ورکس۔ دہلی (۱۹۵۲ء)

زندگانیٔ بے نظیر (عبدالغفور شہباز) مطبع نولکشور۔ لکھنؤ (۱۹۰۰ء)

تقویت الایمان (مولانا محمد اسمٰعیلؒ) مطبع مصطفائی۔ دہلی (۱۲۶۹ھ)

مرقع الود (محمد مخدوم تھانوی) مطبع آگرہ اخبار۔ آگرہ (۱۸۷۶ء)

واقعات دار الحکومت دہلی (بشیر الدین احمد) شمسی مشین پریس۔ آگرہ (۱۹۱۹ء)

آبِ حیات (آزاد) اسلامیہ سٹیم پریس۔ لاہور (۱۹۱۷ء)

مرحوم دہلی کالج (عبدالحق) مفید عام پریس۔ لاہور (۱۹۴۵ء)

کلامِ عاصی (گھنشام لال عاصی) دیال پرنٹنگ پریس۔ دہلی (۱۹۴۰ء)

لال قلعہ کی ایک جھلک (ناصر نذیر فراق) مطبع چہارم امپیریل پرنٹنگ پریس۔ دہلی

دہلی کا آخری سانس (حسن نظامی) دہلی پرنٹنگ ورکس۔ دہلی (۱۹۲۵ء)

غدر کی صبح شام (حسن نظامی) ہمدرد پریس۔ دہلی (۱۹۲۶ء)

حیاتِ جاوید (حالی) لطیفی پریس۔ دہلی (۱۹۳۹ء)

چراغِ دہلی (مرزا حیرت) کرزن پریس۔ دہلی (۱۹۰۶ء)

سیاح (میاں دادخاں سیاح) مطبع نولکشور، لکھنؤ (۱۸۷۲ء)
چند ہمعصر (عبدالحق) ناظر پریس۔ کراچی (۱۹۵۰ء)
تاریخ صحافت اردو (امداد صابری) فاروقی پریس۔ دہلی (۱۹۵۳ء)

موقت الشیوع رسائل

آج کل۔ دہلی
آفاق۔ کراچی
ادبی دنیا۔ لاہور
اردو۔ دہلی و کراچی
اردو ادب۔ علی گڑھ
جامعہ۔ دہلی
زمانہ۔ کانپور
علی گڑھ میگزین۔ علی گڑھ
نگار۔ لکھنؤ
نوائے ادب۔ بمبئی
ماہِ نو۔ کراچی
ہندستانی۔ الہ آباد

اشاریہ

(اس کے ساتھ فہرست مضامین کو بھی مدنظر رکھئے)

مکاتیبِ غالب

مرتبہ

امتیاز علی خاں عرشی

دربارِ رامپور سے متعلق خطوطِ غالب کا نادر مجموعہ، دیباچوں اور حواشی سمیت جسے عرشی صاحب نے بڑی کاوش سے ترتیب دیا ہے۔

"مکاتیبِ غالب" ایک عرصہ سے نایاب تھی۔ اب اس کا سستا ایڈیشن شائع ہوا ہے۔

سائز $\frac{20 \times 26}{8}$ — صفحات ۴۳۰

قیمت -/۴ مجلد

مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی